بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

اس وقت مسلم دنیا کے جو حالات ہیں، وہ انتہائی نا گفتہ بہ اور نا قابل بیان ہیں، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے دنیا کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس سے بظاہر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت جاں بلب اور عالم نزع میں ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا گوشہ نظر نہیں آتا ہے جہاں مسلمان عافیت اور امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہو، دنیا کے نقشے پر مسلمانوں کی جو حالت ہے، اور اسلام کا نام لینے والے جن آزمائشوں سے دوچار ہیں، اس کے تصور سے بھی دل دہل جاتا ہے اور قلب وجگر کانپ جاتے ہیں، اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں، اس کو سوچ کر پتھر بھی اپنی جگہ پگھل جائے ،لیکن ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا درد اور کرب اگر نہ محسوس ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے اندر سے اسلامی حس ختم ہو چکی ہے، اور انسانی ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کی باہمی ہمدردی، آپسی بھائی چارگی اور اتحاد و یگانگت کا حال تو ویسا ہونا چاہئے جیسا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ **مثل المؤمنين في توادّهم، وتراحمهم، وتعاطفهم مثل الجسد إذا اشتكى منه تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى** (مسلم شریف) یعنی مسلمانوں کی مثال ان کی باہمی محبت، آپس کی رحم دلی، اور ایک دوسرے پر شفقت ومحبت میں ایک جسم کی طرح ہے، کہ جسم کے کسی عضو کو کوئی عارضہ پیش آجائے، تو تمام جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: **المؤمنون كرجل واحد إن اشتكى رأسه تداعى له سائر الجسد بالحمى والسهر**. تمام مسلمان فرد واحد کی طرح ہیں، اگر اس کے سر میں کوئی شکایت ہو جائے تو پورا جسم بخار اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم

ممالک، بیشتر جگہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ؎

ایک دو زخم نہیں سارا بدن ہے چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کہاں سے نکلے

افغانستان، عراق، شام اور برما وغیرہ کے مسلمانوں کا خون ابھی منجمد نہیں ہوا تھا، کہ دریائے نیل مصری مسلمانوں کے خون سے سرخ ہو گیا، اور مصر جو کبھی اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا، اور جس کی آغوش میں اسلامی تاریخ کے بے شمار بلند پایہ علماء اور مصنفین پروان چڑھے تھے، آج اس میں اسلام کا نام لینے والوں کا قافیہ تنگ ہے، ان کے خون ناحق سے اس کا چپہ چپہ لہولہان ہے، اور بظاہر مسلمان نظر آنے والوں نے ہی اسلام کے علم برداروں کا اس قدر خون بہایا ہے کہ اس کے سامنے ظلم وستم کی تمام داستانیں ہلکی نظر آتی ہیں، ظلم وستم کی خوفناک داستانوں سے تو دنیا کی تاریخ سیاہ ہے، لیکن ایسے مظالم کم ہی سننے یا دیکھنے اور پڑھنے میں آئے ہیں کہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والوں پر اسی ملک کے برسر اقتدار طبقے نے فضا اور زمین سے ایک ساتھ گولیوں کی برسات کے ساتھ اس طرح بلڈوزر چلوا دیے ہوں، جس طرح کھیتوں میں ہل چلائے جاتے ہیں، عورتوں اور بچوں میں تمییز نہ کی گئی ہو، بے دردی کے ساتھ ان کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہو، مسجدوں کی حرمت کو پامال کیا گیا ہو۔ خدا کرے پانی سے زیادہ ارزانی کے ساتھ بہنے والے شہیدوں کے خون سے آبیار ہو کر عالم انسانیت اور خاص طور سے عالم اسلام اسی طرح لالہ زار اور پُر بہار ہو جائے، جس طرح پانی پا کر نرم زمین کشت زار ہو جاتی ہے۔

مگر برا ہو عصر حاضر کی سیاست کا، اور ناس ہو انسانیت کا خون بہا کر بساط سیاست پر رقص کرنے والوں کا۔ اف آج کی سیاست، جمہوریت اور دعوائے جمہوریت ع

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

کہیں جمہوریت کے نام پر انسانوں کا قتل عام ہے، تو کہیں خود جمہوریت کا قتل ہے، مصر کی سرزمین عرصۂ دراز کی ڈکٹیٹرشپ اور مطلق العنانی کے بعد حقیقی جمہوریت سے آشنا ہوئی تھی، لیکن اس جمہوریت میں چونکہ اسلامی فکر ونظر کا کچھ عکس نظر آتا تھا، اس لیے خود ساختہ جمہوریت کے علم برداروں کے لیے یہ کسی طرح قابل برداشت نہیں تھا، اور اس کو بیخ وبن سے اکھاڑنا ضروری تھا، اس کے لیے

مصر میں جو کچھ ہوا، وہ انسانیت کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

مصر کے روح فرسا واقعات کے درمیان ہی ایک شب میں یہ افسوسناک خبر سماعت سے ٹکرائی کہ ہمارے اپنے صوبے اتر پردیش کے مغربی علاقے کے مشہور شہر مظفرنگر میں ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑک اٹھی ہے، اور چشم زدن میں یہ آگ نہ صرف پورے شہر میں پھیل گئی، بلکہ گردونواح اور قریب پاس کے گاؤں اور دیہاتوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور دو چار نہیں پچاسوں افراد دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل بن گئے ہیں، نہ جانے کتنی عورتیں بیوہ اور کتنی تعداد میں بچے یتیم ہوگئے، کتنے گھر ویران ہوگئے، اور خوف ودہشت کی وجہ سے ہزاروں افراد (تقریباً پچاس ہزار) ریلیف کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ مظفرنگر کا یہ فساد ہندوستان کی جمہوریت پر ایک اور بدنما داغ ہے، قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے، اس نے ملک کے امن پسند طبقے بالخصوص مسلمانوں کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس فساد کو کنٹرول کرنے میں جہاں حکومت کی ناکامی اور سرکاری مشنریوں کی مجرمانہ غفلت ولاپروائی کھل کر سامنے آئی ہے، وہیں یہ حقیقت بھی واشگاف ہوگئی ہے کہ ہمارے ملک کی سیاسی پارٹیاں صرف مسلمانوں کو بہلا پھسلا کر ان کا ووٹ لینے کے کام کی ہیں، ان کو کچھ دینے کی نہیں ہیں۔ مساوی شہری حقوق تو درکنار، جائز بنیادی حقوق حتی کہ ان کے جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کو بھی یقینی نہیں بنا سکتیں، یہاں مسلمان چونکہ ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں، اور ان کے ووٹ اور رائے دہی سے ہی کوئی پارٹی تخت وتاج اور کرسی اقتدار تک پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے ان کے ووٹ پر ساری پارٹیوں کی حریصانہ نگاہ رہتی ہے، یہ اس ملک کی ایک ایسی سیاسی مجبوری ہے کہ اس کی وجہ سے یہاں کی ہر سیاسی پارٹی کچھ خاص دنوں کے لیے مسلمانوں کی رضا جوئی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہے، اور شاید یہی وہ مجبوری ہے جس نے اس ملک کے سیکولرزم اور اس کی برائے نام سیکولر شبیہ کو باقی رکھا ہے۔

مسلمان تو اس ملک کا ایک وفادار شہری ہے، اور اس نے اس کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا ہے، لیکن یہ ملک عزیز کی بہت بڑی بدبختی اور اس کے لیے بہت بڑا المیہ ہے کہ اس کی وفاداریوں کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، ان کی قربانیوں سے صرف نظر کیا گیا ہے، ان کی تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی ترقی کے لیے کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا، نہ صرف یہ کہ ان کو اٹھانے اور

صدمۂ جانکاہ

پیش نظر شمارہ پریس میں جانے کے لیے تیار تھا کہ ۲۲/ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۹/ستمبر ۲۰۱۳ء کی شب میں تقریباً ساڑھے گیارہ بجے مدیر تحریر حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ادارہ المآثر کے لیے یہ نہایت سنگین حادثہ ہے، آپ کے حالات پر مستقل مضمون انشاء اللہ آئندہ شمارے میں شائع ہوگا۔

ماخوذ:ازتفسیرعزیزی (مسلسل)

تفسیر سورۂ عبس

وہ اولین لوگ جو اپنے اقرباء سے بھاگیں گے:

کہتے ہیں سب سے پہلے جو شخص اپنے بھائی سے بھاگے گا، وہ قابیل ہوگا جو اپنے بھائی ہابیل سے بھاگے گا تاکہ وہ دنیا کے خون کا اس سے مطالبہ نہ کرے، اور سب سے پہلے جو اپنی ماں اور باپ سے بھاگے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں گے کہ کہیں وہ شفاعت کے لیے منت وزاری نہ کرنے لگیں اور کافر کے حق میں سفارش قبول نہیں ہے۔

اور اپنی بیوی سے بھاگنے والے سب سے پہلے حضرت نوح وحضرت لوط علیہما السلام ہوں گے، ان دونوں کی بیویاں منافق تھیں اور منافق کے حق میں سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔

اپنے بیٹے سے بھاگنے والوں میں بھی سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام ہوں گے، ان کا بیٹا کنعان کفر کی حالت میں مرا تھا۔

اپنے اقرباء سے بھاگنے کی وجہ:

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ قیامت کے دن آدمی اپنے رشتہ داروں سے کیوں بھاگے گا؟ بعض نے کہا کہ حقوق کے مطالبے کے خوف سے بھاگے گا، یعنی دنیا میں مجھ سے اس کی جو کچھ حق تلفی ہوئی ہے کہیں اس کا مطالبہ نہ کر بیٹھے، جیسے مفلس آدمی اپنے قرض خواہ سے بھاگتا ہے، چنانچہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ قیامت کے دن آدمی اپنے دوستوں آشناؤں سے زیادہ بھاگے گا، غیروں سے اتنا نہیں بھاگے گا، اس لیے کہ دنیا میں اجنبی اور ناآشنا لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا کہ آج کسی قسم کے مطالبے کا خوف ہو۔

بعض نے کہا کہ مدد وشفاعت کے خوف سے بھاگے گا کہ ایسا نہ ہو کہ میرے آشنا ورشتہ دار کو دوزخ کا حکم ہو اور وہ مجھے دیکھ کر مجھ سے کچھ نیکیوں کی درخواست کرنے لگ جائے، یا کہیں اس کے گناہوں میں سے کچھ مجھ سے لینے نہ پڑ جائیں، چنانچہ قحط سالی میں لوگ اسی طرح ایک دوسرے سے بے التفاتی کرتے ہیں۔

بعض نے کہا اپنے رشتہ دار کو عذاب میں دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوگا اور نہ ہی نیکیاں دینے یا سفارش کرنے کی طاقت ہوگی، اس لیے چھپتا پھرے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ سب وجوہات ہوں گی، کوئی ایک وجہ سے بھاگے گا، کوئی دو، یا تین وجہ سے بھاگے گا، بلکہ اس دار و گیر کے دن ہر شخص اپنے ہی حال میں گرفتار ہوگا (بدحواسی ایسی ہوگی کہ اپنی فکر میں بھاگتا پھرے گا کسی اپنے کی طرف) کوئی توجہ نہیں کرے گا، چنانچہ فرماتے ہیں:

لِكُلِّ امْرِىٍٔ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝

ہر مرد کو ان میں سے اس دن ایک فکر لگا ہوا ہے جو اُس کے لیے کافی ہے

یعنی ہر شخص پر اس دن غم و تشویش کی ایسی حالت ہوگی جو اس کو بے پرواہ کر دے گی اس کو اتنی فرصت ہی نہ ملے گی کہ دوسروں کی حالت کی طرف توجہ کر سکے۔

پھر اس حادثہ کے دن عزت و ذلت کے لحاظ سے لوگوں کی الگ الگ حالت ہوگی، چنانچہ فرمایا:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝

کتنے منھ اُس دن روشن ہیں

یعنی بہت سے چہرے اس دن روشن ہوں گے، اس لیے کہ ان کا نورِ ایمانی باطن سے ظاہر پر جلوہ افروز ہو کر چہروں کو روشن کر دے گا۔

ضَاحِكَةٌ

ہنستے

یعنی ہنستے ہوں گے، اس لیے کہ اپنے اندر جب انعام و اکرام کے آثار محسوس کریں گے تو ملنے کی توقع پر ہنستے ہوں گے۔

مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝

خوشیاں کرتے

یعنی خوشیاں مناتے ہوں گے، اس لیے کہ مسلسل انعام و اکرام میں اضافہ ہوتا رہے گا اور خوشی و راحت کے اسباب روز بروز بڑھ رہے ہوں گے۔

وَّوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ○

اور کتنے منہ اُس دن اُن پر گرد پڑی ہے

یعنی بہت سے چہرے اس دن ایسے ہوں گے جن پر سیاہی وغبار ہوگا، یہ وہ گناہوں کی تاریکی ہے جو دنیا میں ان کے دلوں پر جم گئی تھی، اب وہ باطن سے چہرے پر ظاہر ہوگی۔

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ○

چڑھی آتی ہے ان پر سیاہی

یعنی ان پر سیاہی چڑھ رہی ہوگی، یہ کفر کی سیاہی ہوگی جو گناہوں کی سیاہی کے اوپر آجائے گی، کفر کی سیاہی اگرچہ دل کی گہرائی میں ہوتی ہے، گناہوں کی تاریکی سے بھی زیادہ پوشیدہ لیکن اس دن کفر کی شدت وغلبہ کی وجہ سے یہ تاریکی گناہوں کی تاریکی کے اوپر چڑھ جائے گی، جیسے تیل کو جتنا ہی پانی کے نیچے ڈالیں وہ پانی کے اوپر ہی چڑھ جاتا ہے، چنانچہ فرمایا:

اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکَفَرَةُ الْفَجَرَةُ○

یہ لوگ وہی ہیں جو منکر ہیں ڈھیٹھ

یعنی یہی منہ کالے لوگ کافر وبدکار ہیں، جو کفر بھی کرتے تھے اور گناہ بھی کرتے تھے، آج انتہائی ذلت وخواری کے سزاوار ہوئے، ان کی انسانیت کچھ کام نہ آئی، کسی اکرام کے مستحق نہ ٹھہرے، حالانکہ پہلی دفعہ دنیا کی پیدائش میں یہ بڑے معزز ومکرم تھے، خدا کی ساری عنایات ان کی پرورش میں کارفرما تھیں۔

دوطرح کی سیاہی کے مستحق لوگ:

جو لوگ کفر کے ساتھ گناہ بھی کرتے تھے دورنگوں کی سیاہی ان کی خصوصیت ہے، گناہوں کا رنگ سیاہ مٹیالا ہوگا، اور کفر کا رنگ سیاہ بھورا، جو لوگ صرف گناہ کرتے تھے، یا صرف کفر کے مرتکب تھے ان کے لیے ایک ہی رنگ ہوگا۔

سورۂ عبس میں خاص فوائد وحکمتیں:

اب یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے عتاب وناراضگی کا ذکر ہے جو محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جلیل القدر پیغمبر پر ہوئی تو اس کے نازل کرنے میں کیا حکمت ہے؟ بظاہر عقل میں یوں آتا ہے کہ اس عتاب وخطاب کو پوشیدہ طریقے سے جبرئیل امین کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دیتے، اور لوگوں کو معلوم نہ ہوتا، لیکن بجائے اس کے یہ قصہ قرآن بن کر نازل ہوا، قیامت تک لوگوں کی زبانوں پر تلاوت کی صورت میں جاری رہے گا اور تازہ رہے گا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ دراصل اس میں بہت سے تعلیم وارشاد کے فوائد وآداب اور حسنِ اخلاق کے قواعد تھے، اس لیے رحمت باری تعالیٰ نے چاہا کہ اس قصہ کو قرآن کا جز بنادیا جائے تاکہ لوگ ہمیشہ ان سے فیضیاب ہوتے رہیں، محروم نہ رہیں۔

ان سب فوائد میں سے بعض ہم یہاں ذکر کرتے ہیں اور باقی سننے والے کی عقلِ کامل وفہمِ صائب کے سپرد کرتے ہیں۔

انبیاء کی خطاء اجتہادی:

فائدہ نمبر ا: کبھی کبھی انبیاء کرام بھی اجتہاد کرتے اور اپنی عقل کے مطابق کوئی فیصلہ کرتے ہیں، بسا اوقات اجتہادی خطا ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ فوراً آگاہ فرما دیتے ہیں اس خطا پر برقرار نہیں رہنے دیتے۔ چنانچہ اس قصے میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں سمجھا کہ نفع عام کو نفع خاص پر مقدم رکھنا چاہئے، ان سرداروں کو اسلام کی دعوت دینے میں نفع عام ہے، نابینا کو قرآن کی تعلیم دینا نفع خاص ہے، لہٰذا دعوت کو تعلیم قرآن پر ترجیح دینا چاہئے، پھر یہ کہ نابینا صاحب خود طالب صادق اور شوقین ہیں فوری توجہ ان کی طرف نہ ہوئی تو بھی ان کا شوق انہیں محروم نہیں ہونے دے گا، یہ سیکھ ہی لیں گے، یہاں یہی خطا ہوئی کہ نفعِ عام جو موہوم تھا اس کو نفعِ خاص جو کہ ظاہر اور یقینی تھا پر ترجیح دی گئی۔

نفعِ عام کب نفعِ خاص پر مقدم ہوتا ہے:

فائدہ نمبر۲: یہاں سے معلوم ہوا کہ نفعِ عام، نفعِ خاص پر اس وقت مقدم ہوتا ہے جب دونوں معلوم یا دونوں موہوم ہوں، موہوم کو معلوم پر ترجیح دینا صحیح نہیں۔

دعوت، تعلیم پر کب مقدم ہے:

فائدہ نمبر۳: اسلام کی دعوت کو قرآن کی تعلیم پر اس وقت ترجیح دینی چاہئے جب اس کے

قبول ہونے کا یقین ہو، اگر قبول کرنے کا یقین نہ ہوتو اتمام حجت ایک دفعہ دعوت پہنچا دینے سے بھی ہوجاتا ہے اصرار کرنے کی ضرورت نہیں، ایسے میں دین کے دیگر امور کو نہ چھوڑنا چاہئے۔ اسی طرح نافرمانوں کو مطیع وفرماں بردار بنانے کی کوشش اس وقت کرنی چاہئے جب ان سے ماننے کی توقع ہو، جب پہلے سے نا اُمیدی ہوتو گویا ٹھنڈا لوہا پیٹنا ہے۔

اشتباہ کے وقت غرضِ صالح کا ترک لازم ہے:

فائدہ نمبر۴: اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ اگر غرضِ صالح بظاہر غرضِ فاسد کے ساتھ مشتبہ ہونے لگے تو غرض صالح کو چھوڑ دینا ضروری ہے، اسی وجہ سے فرمایا ہے ''**اتقوا مواضع التھمة**'' تہمت کی جگہوں سے بچو۔

یہاں پر ان سرداروں، مالداروں کی خاطر داری اور اندھے فقیر سے بے توجہی سے یہ گمان ہوسکتا تھا کہ دنیاداروں، مالداروں کی دلداری ہورہی ہے، دل میں ان کی عظمت ہے، اور فقراء کی قدر نہیں، اس لیے اس تہمت کے اندیشہ سے ان کو دعوت دینا چھوڑ دینا چاہئے تھا۔

رتبہ کی بلندی وجہ عتاب ہوسکتی ہے:

فائدہ نمبر۵: یہ بھی معلوم ہوا کہ بسا اوقات کوئی کام جس کا مرضی حق کے خلاف ہونے کا علم پہلے سے نہیں ہوتا، لیکن کرنے والا انتہائی بلند مرتبہ ومنصب، عظیم قوتِ استعداد رکھنے والا ہوتا ہے، اس وجہ سے اس پر شکوہ ہوسکتا ہے اگر چہ پہلے سے اس کا گناہ ہونا معلوم نہ ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے مرضی حق کے خلاف ہونے کا پہلے سے علم نہیں تھا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر خفگی ہوئی۔

واجب التعظیم شخص کی تعظیم ضروری:

فائدہ نمبر۶: جو شخص واجب التعظیم ہو اس کی تعظیم ضروری ہے، چاہے وہ اس وقت تعظیم سے بے خبر ہو، وہ صحابی نابینا ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی کیفیت سے بے خبر تھے کہ آپ اس وقت ترشی میں ہیں یا بشاشت میں، چہرۂ مبارک ان کی طرف ہے یا دوسری طرف پھیر دیا ہے، مگر چونکہ وہ صحابی ایمان اور اللہ کی راہ کے طالب تھے، اس لیے ان کی تعظیم ضروری تھی اس کے ترک پر خفگی ہوئی، اسی وجہ سے حدیث شریف میں ہے: ''**ترک السلام علی الضریر**

خیــانة‘‘ نابینا پرسلام نہ کرنا خیانت ہے، کیونکہ اگر چہ وہ ترکِ سلام سے رنجیدہ نہ ہو لیکن اسلام کا حق تو تلف ہوا۔

کفار کی طرف میلان کا حکم:

فائدہ نمبر۷: یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی غرض شرعی کی وجہ سے کفار کی طرف کبھی مائل ہو جانا ان کی طرف توجہ کرنا اگر چہ جائز ہے لیکن ضرر سے خالی نہیں۔

مسلمان سے بے توجہی کرنا:

فائدہ نمبر۸: مسلمان سے منھ پھیرنا، یا کسی درجے میں اس کی اہانت کرنا، چاہے بلا قصد وارادہ ہی ہو، قباحت سے خالی نہیں۔

دوست پر خفگی کا اظہار کرنا:

فائدہ نمبر۹: یہ بھی معلوم ہوا کہ دوستوں سے کبھی کوئی کوتاہی ہو جائے تو تنبیہ اور خفگی کا اظہار کر دینا چاہئے، اسی سے دوستی اور محبت باقی رہے گی، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے ’’ویبقی الوُد ما بقی العتاب‘‘ جب تک شکوہ باقی تب تک دوستی بھی باقی ہے، شکوے شکایت چھوڑ دینے کا مطلب ہوتا ہے لاتعلقی اختیار کر لینا۔

سرکار کا اپنے آدمی سے باز پرس کرنا:

فائدہ نمبر۱۰: یہ فائدہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص کسی عہدے اور منصب پر فائز کیا جائے تو چاہے وہ حاکم کا مقرب ہی ہو، اس کے حالات سے باخبر رہنا، اور اس کی باز پرس کرتے رہنا چاہئے، اس سے غفلت نہیں برتنی چاہئے، ورنہ یہ عہدیدار مطلق العنان بن جائیں گے اور کاروبار سلطنت میں خلل پیدا کریں گے۔

کسی کو حقیر نہ جاننا چاہئے:

فائدہ نمبر۱۱: یہ فائدہ بھی معلوم ہوا کہ بظاہر کوئی کتنا ہی حقیر نظر آتا ہو کسی کو کبھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے، کیا پتہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا کیا مرتبہ ومقام ہو۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سواری باشد

وہ نابینا ظاہر میں حقیر معلوم ہوتا تھا،لیکن اس کی وجہ سے کائنات کے سردار پر عتاب ہوا۔

موانع کی وجہ سے طلب علم نہ چھوڑا جائے:

فائدہ نمبر۱۲: یہ بھی معلوم ہوا کہ طالب علم کو اگر چہ رکاوٹیں پیش آئیں طلب علم کو نہ چھوڑے، یہ اندھا فقیر اس کا ہاتھ پکڑنے والا بھی کوئی نہ تھا، اس کے باوجود تحصیل علم کے لیے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ کوئی اگر طلب علم کی راہ میں، اللہ تعالیٰ کے راستے میں موانع ومشکلات کا بہانہ کرے، وہ کبھی مقصود تک نہ پہنچ سکے گا، اس لیے کہ کوئی بھی آدمی اپنے حالات کے مطابق موانع سے خالی نہیں۔

استاذ ومرشد شفقت کو لازم پکڑیں:

فائدہ نمبر۱۳: یہ بھی معلوم ہوا کہ استاذ کے لیے لازم ہے کہ طالب علم پر شفقت کرے، مرشد کے لیے ضروری ہے کہ راہِ خدا کے طالب پر شفقت وعنایت کرے اور اس کو مطلوب تک پہنچنے میں پوری مدد کرے۔

فرقِ مراتب میں مال وجاہ کا لحاظ نہیں:

فائدہ نمبر۱۴: یہ بھی معلوم ہوا کہ استاذ اپنے شاگردوں کے درمیان اور مرشد اپنے مریدوں کے درمیان دنیاوی مال وجاہ کی بنیاد پر فرق مراتب نہ کرے، بلکہ شوق کی کثرت اور استعداد کی قوت کے اعتبار سے فرق وامتیاز رکھے۔

چھوٹوں سے رنج کا تدارک:

فائدہ نمبر۱۵: یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی بڑے سے کسی چھوٹے کو کوئی رنج وتکلیف کی بات پہنچ جائے تو بڑے کو فوراً اس کا تدارک کرنا چاہئے، یہ بات بڑے کے مرتبے کے خلاف نہیں بلکہ اس سے ان کے مرتبہ وعزت میں اضافہ ہی ہوگا، کمی نہیں ہوگی، دیکھئے ان آیتوں کے نازل ہوتے ہی کس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان نابینا صحابی کے پیچھے دوڑ پڑے، ان امراء وسرداروں کی کوئی پرواہ نہ کی، کیا ہی خوب کسی نے کہا ہے ؎

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

روٹھے کو منانا اور عزت افزائی کرنا:

فائدہ نمبر ۱۶: یہ بھی معلوم ہوا کہ روٹھے کو منایا جائے تو اس کی عزت ومرتبہ پہلے سے زیادہ بڑھادیا جائے تا کہ زخم کا مرہم ہوسکے، اس لیے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان نابینا صحابی کو راستے سے واپس لائے تو اپنی چادر بچھائی، اس پر بٹھایا اور فرمایا "أنت في عيال محمد ما بقيت" جب تک زندہ ہو میرے عیال میں ہو، تمہاری کفالت میں ہی کروں گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وحی پوشیدہ نہیں رکھی:

فائدہ نمبر ۱۷: قرآن کریم کے اندر ان آیات کے باقی رہنے سے معلوم ہوا کہ وحی پہنچانے میں پیغمبر انتہائی امانت دار تھے، اور وحی میں سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی ورنہ یہ عتاب وشکایتِ باری تعالیٰ آپ پر نہایت گراں، کسرِ شان کا باعث تھی اگر کچھ پوشیدہ رکھتے تو اس وحی کو کبھی لوگوں کے کان تک نہ پہنچنے دیتے، چنانچہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی میں سے کبھی کچھ پوشیدہ رکھتے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے قصے کو پوشیدہ رکھتے۔

طالب علم خدا سے ڈرنے والا ہونا چاہئے:

فائدہ نمبر ۱۸: یہاں ایک فائدہ یہ بھی معلوم ہوا کہ طالب علم خدا سے ڈرنے والا ہونا چاہئے، اس لیے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس طالب علم کی مدح کرتے ہوئے فرمایا "وَاَمَّامَنْ جَاءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى".

اللہ کے نافرمان رشتہ داروں سے صحبت نہ رکھنا:

فائدہ نمبر ۱۹: اس مجلس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب اور دوسرے قریبی رشتہ دار ابوجہل وغیرہ تھے، ان کے اختلاط وصحبت کی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب نازل ہوا، حالانکہ یہ قریبی رشتہ دار تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر اقرباء اللہ کے نافرمان ہوں تو ان سے میل جول زیادہ نہ رکھا جائے، ان کی مجلس وصحبت اختیار نہ کی جائے، دوسرے غیر رشتہ دار جو نیک ہوں ان کی صحبت ومجلس کو اختیار کرنا چاہئے، اس لیے کہ دوست کے دشمنوں کو دوست رکھنا بڑی غلطی ہے، اسی طرح دوست کے دوست سے منھ پھیرنا بھی افسوس کا مقام ہے، اسی لیے قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

”لا تَجِدُ قَوْماً يُؤمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوا اٰبَاءَ هُمْ اَوْ أَبْنَاؤهُمْ اَوْ اِخْوَانُهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ“

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تعلیم وتربیت، ارشاد وتزکیہ میں بھی استعداد وشوق والوں کو قرابت والوں پر مقدم رکھنا چاہئے۔

جوعتاب کا سبب بنے اس کے ساتھ برتاؤ:

فائدہ نمبر۲۰: یہ فائدہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ایک آدمی پر کسی دوسرے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، یا پیغمبر خدا کی طرف سے، یا استاذ ومرشد کی طرف سے کوئی عتاب وناراضگی واقع ہوتو جس پر عتاب ہوا وہ اس دوسرے آدمی سے جس کی وجہ سے عتاب ہوا نفرت وبغض نہ رکھے، بلکہ اس سے زیادہ دوستی رکھے کہ وہ اس کے لیے ایک بہت بڑے فائدے کا ذریعہ بنا، یعنی اس کی وجہ سے اس کو ادب سکھلایا گیا، چنانچہ اس عتاب کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقتیں اورعنایات اُن نابینا صحابی پر بڑھ گئی تھیں، نہایت عزت کرتے، دیکھتے ہی مرحبا کہتے، قریب بٹھاتے اوران کی حاجتیں پوری فرمایا کرتے تھے۔

واللّٰہ الموفق المعین وبہ نستعین تم نقل تفسیر سورۃ عبس والحمدللّٰہ اولا وآخراً.

الازہار المربوعہ

باب دوم

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''اس حدیث کے کل رواۃ عادل ضابط اور ثقہ ہیں اور کوئی علت قادحہ موجود نہیں، سند میں اتصال ہے پھر یہ حدیث غلط کیوں ہوگی، علامہ باجی کتاب المنتقی میں اس اعتراض کا جواب یوں تحریر فرماتے ہیں ......میرے نزدیک ابن طاؤس کی یہ روایت صحیح ہے کیونکہ اس کو ابن طاؤس سے اجلۂ محدثین امام معمر اور امام ابن جریج وغیرہما روایت کرتے ہیں اور ابن طاؤس خود امام المحدثین ہیں اور جس حدیث کو بعض محدثین غلط و وہم کہتے ہیں وہ وہی حدیث ہے ابن طاؤس اپنے باپ طاؤس سے اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں (انتہٰی باختصار ما)

جواب: -اولاً تو اسی میں کلام ہے کہ اس حدیث کے کل رواۃ عادل ضابط اور ثقہ ہیں اس لیے کہ حافظ ابوعمرو ابن عبدالبر کے کلام سے جو الجوہر النقی میں منقول ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حدیث طاؤس نے حضرت ابن عباس سے بواسطہ ابوالصہباء روایت کی ہے اور ابوالصہباء بتصریح ابن عبدالبر مولی ابن عباس میں غیر معروف ہے، اور امام بیہقی کے قاعدہ سے بھی یہ حدیث بواسطۂ ابوالصہباء ہے جیسا کہ علامہ ابن الترکمانی نے ثابت کیا ہے **فلیراجع الی الجوهر النقی.**

ثانیاً: -یہ بھی صحیح نہیں کہ اس میں کوئی علت قادحہ موجود نہیں ہے امام بیہقی اور ان سے پہلے امام احور اس میں یہ علت بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث ابن عباس کی دوسری تمام روایتوں کے خلاف ہے (دیکھو جوہر نقی و اعلام الموقعین)

ثالثاً: -علامہ باجی کا کلام نقل کرنے میں آپ نے کمال کر دیا ہے، اپنی مطلب کی بات تو لے لی اور جو خلاف مطلب تھی اس پر پردہ ڈالنے کی شرمناک کوشش کی۔ ناظرین کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ

باجی نے اس حدیث کو صحیح مانا ہے لیکن جو مطلب اس کا مجیب صاحب اور ان کے ہم خیال سمجھتے ہیں اس کو بالکل غلط قرار دیا ہے چنانچہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں **ومعنی هذا الحديث انهم كانو يوقعون طلقه واحدة بدل ايقاع الناس ثلاث طلقات ويدل على صحة هذا التاويل ان عمر بن الخطاب رضى الله عنه قال ان الناس قد استعجلوا فى امر كانت لهم فيه اناة افنكر عليهم ان احدثوا فى الطلاق استعجال امر كانت لهم فيه اناة فلو كان حالهم ذلك من اول الاسلام فى زمن النبى صلى الله عليه وسلم ما قاله ما عاب عليهم ان استعجلوا فى امر كانت لهم اناة ويدل على صحة هذالتاويل ما روى عن ابن عباس عن جعفر طريق انه افتى بلزوم الثلث لمن اوقعها مجتمعة فان كان هذا معنى حديث ابن طاؤس فهو الذين قلناه وان حمل على حديث ابن طاؤس على ما يتاؤل فيه من لا يعبأ بقوله فقد رجع ابن عباس الى قول الجماعة وانعقد به بالاجماع.**

یعنی اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ تین طلاق کے بدلے ایک طلاق دیتے تھے اور اس تاویل کی صحت پر حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا دلالت کرتا ہے کہ لوگوں نے ایک ایسی بات میں جلدی کی جس میں ان کے لیے مہلت اور دیر تھی، پس حضرت عمرؓ نے ان کی اس بات پر اعتراض وانکار کیا کہ انھوں نے طلاق میں ایک ایسا امر استعمال کرنا جاری کیا جس میں ان کے لیے دیر ہوا کرتی تھی (یعنی جس بات کو مہلت کے ساتھ اور دیر دیر کے بعد کرتے تھے۔ اس میں جلد بازی کرنے لگے پہلے تین طلاقیں تین طہروں میں دیا کرتے تھے، تو اب ایک ہی وقت میں تینوں دینے لگے) پس اگر اول اسلام سے عہد نبوی میں تینوں طلاقیں بیک مجلس دیتے ہوتے تو حضرت عمرؓ جلد بازی کا عیب ان کو نہ لگاتے، اور اس تاویل کی صحت پر وہ چیز بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے متعدد طریقوں سے مروی ہے کہ انھوں نے تین طلاقوں کے لازم ہونے کا فتویٰ دیا، پس اگر ابن طاؤس کی حدیث کا یہی مطلب ہو تو یہی ہمارا کہنا ہے۔ اور اگر اس کو اس معنی پر حمل کیا جائے جس کو بعض وہ لوگ بیان کرتے ہیں جن کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے تو معلوم ہونا چاہئے کہ ابن عباسؓ نے جماعت صحابہ کے قول کی طرف رجوع کرلیا ہے اور جماعت کے قول پر اجماع ہو چکا ہے۔ دیکھئے علامہ باجی اس حدیث کو صحیح تو مانتے ہیں لیکن اس کا وہ مطلب بیان کرتے ہیں جو ہمارے مدعا کے خلاف نہیں ہے۔ اور جو مطلب اس کا مجیب صاحب کے ہم خیال بیان کرتے ہیں اس

کو نا قابل اعتبار و نالائق التفات لوگوں کا قول قرار دیتے ہیں۔ پس اگر مجیب صاحب علامہ ابوالولید کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں اور تصحیح حدیث میں ان کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہیں تو حدیث کے معنی میں بھی ان کی تحقیق پر آمنا وصدقنا کہنا چاہئے۔ اگر وہ ایسا کریں تو ہمارے ان کے درمیان کوئی نزاع نہیں رہ جائے گی، اور اگر مجیب صاحب اس کے لیے آمادہ نہ ہوں تو ان پر بعینہ وہ مثل صادق آئے گی کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔ حاصل کلام یہ کہ علامہ باجی کی یا تو دونوں باتیں تسلیم کیجئے یا دونوں چھوڑ یئے۔ یعنی ؎

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا سراسر موم ہو یا سنگ ہوجا

اس کے بعد مجیب صاحب نے ابوالصہبا کی توثیق وتعریف کا بے موقع ذکر چھیڑ دیا ہے۔ اور اس کے لیے یہ حیلہ تراشی کی ہے کہ علامہ باجی کا اشارہ اس طرف ہے کہ بعض محدثین جو ابوالصہباء کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں وہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے، جب کہ یہی حدیث بغیر ذکر ابوالصہباء کے آئی ہے، حالانکہ ہر صاحب نظر علامہ باجی کی منتقی کا وہ مقام جہاں کی عبارت مجیب نے نقل کی ہے دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے کہ ان کے کلام میں ابوالصہباء کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی اشارہ ہی پایا جاتا ہے کہ جن محدثین نے اس حدیث کو وہم کہا ہے ابوالصہباء کی وجہ سے کہا ہے اگر مجیب صاحب عقل سے ذرا بھی کام لیتے تو وہ سمجھ سکتے کہ ابوالصہباء کی مجہولیت کی وجہ سے بعض محدثین نے کلام کیا ہوتا اور اس کو باجی نے نقل کیا ہوتا تو اس قسم کا عنوان ہوتا کہ اس حدیث کو بعض محدثین نے ضعیف کہا ہے یا اس کے بعض رواۃ کو مجہول قرار دیا ہے۔ بہر حال یہ مجیب صاحب کا فریضہ ہے کہ وہ ثابت کریں کہ علامہ باجی کی عبارت کے کس لفظ میں یہ اشارہ ہے۔

اس گذارش کے بعد ضرورت تو نہیں ہے کہ مجیب صاحب نے ابوالصہباء کے متعلق جو تطویل لا طائل کی ہے اس کا جواب دیا جائے تاہم ان کی قابلیت کی داد دینے کے لیے چند باتیں عرض کرنی مناسب ہوں گی۔

پہلی بات یہ ہے کہ مجیب صاحب نے ابوالصہباء کی توثیق سے پہلے ابوالصہباء کی وجہ سے اعتراض کرنے والوں کو ناواقفیت اور تعصب وتعصب مذہبی کا الزام لگایا ہے اور آگے چل کر علامہ ماردینی حنفی کی الجوہر النقی کے حوالہ سے اس اعتراض کو نقل کیا ہے، جس سے ناواقفوں کو خواہ مخواہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ اعتراض خود علامہ ماروینی نے کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ علامہ صرف اس اعتراض

کے ناقل ہیں اصل معترض تو ابن عبدالبر ہیں۔ اب ناظرین مجیب صاحب کی اس بدزبانی کو ملاحظہ فرمائیں کہ ابن عبدالبر مالکی جن کی وسعت نظر اور امامت وجلالت قدر کے ذہبی جیسے حفاظ حدیث معترف ہیں ان کو محض ناواقفیت اور تعصب وتعصب مذہبی کا الزام لگانا کتنی بڑی گستاخی وبدزبانی اور چھوٹا منھ بڑی بات کا مصداق ہے۔ مجیب صاحب نے اس کے علاوہ چھپے چھپے اور حملے بھی کئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجیب صاحب نے تقریب جیسی مشہور ومعروف کتاب کا بالکل جھوٹا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ تقریب التہذیب اسماء الرجال میں (حافظ ابن حجر کی بہت معروف ومشہور کتاب) ہے...... ابوالصہباء ابن عباس کے غلام ہیں ان کا نام صہیب ہے، اور اسی تقریب میں دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ نسائی کے راوی ہیں اور بخاری ادب المفرد میں ان کی روایت لائے ہیں۔ ناظرین خط کشیدہ عبارت غور سے پڑھیں اور تقریب کو سامنے رکھ کر بتائیں کہ ابن حجر نے تقریب میں کہاں پر ابوالصہباء ابن عباس کے غلام صہیب نامی کو نسائی کا راوی لکھا ہے اور یہ کہ بخاری ادب المفرد میں اس کی روایت لائے ہیں، اگر مجیب کے نزدیک صداقت کی کوئی قیمت ہو تو اپنے تمام اعوان وانصار سے مدد لے کر تقریب سے خط کشیدہ عبارت کا مضمون ابوالصہباء کی نسبت ثابت کریں ورنہ اپنی غلط بیانی کا اعتراف کریں۔

اصل یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے حضرت ابن عباس کے والد عباس کے غلام صہیب کو نسائی اور الادب المفرد کا راوی بتایا ہے جس کو مجیب صاحب نے اپنی مجتہدانہ قابلیت کی بدولت ابوالصہباء کی نسبت نقل کر دیا لیکن حیرت ہے کہ خلاصہ سے جو ترجمہ انھوں نے نقل کیا ہے وہ ابوالصہباء کا ہے اور خلاصہ میں بالکل صاف صاف م، د، س، کا نشان اس پر دیا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم ابو داؤد اور نسائی کا راوی ہے، کیا یہ نشان مجیب صاحب کو نظر نہیں آیا یا ان کی دیانت نے اس کے اظہار کی اجازت نہیں دی، اور اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ انھیں حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب سے ابوالصہباء کی نسبت نقل کرتے ہیں کہ ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور تہذیب میں ان کے نام سے پہلے م، د، س، کا جو نشان دیا ہوا ہے اس کو نہیں دیکھتے نہ نقل کرتے۔ بلکہ اتنی سی بات کے لیے تقریب کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس شخص کی بے خبری یا دیانت داری کا یہ حال ہو وہ ابن عبدالبر جیسے اکابر علماء کے منھ آئے۔ شرم شرم۔

تیسری بات یہ ہے کہ تہذیب التہذیب کی جو عبارت مجیب صاحب نے نقل کی ہے اس کے بالکل متصل ہی نسائی کا یہ قول مذکور ہے کہ صہیب (ابوالصہباء) ضعیف ہیں۔ مگر مجیب صاحب غایت دیانت داری سے اس کو نقل نہیں کرتے۔ مجیب صاحب کو چاہئے کہ اپنی آثار کا ص ۸۸ و ۸۹ پڑھ کر بتائیں کہ انھوں نے تنبیہ کے عنوان سے جو بات لکھی ہے وہ خود ان پر صادق آتی ہے یا نہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مجیب صاحب نے ابوالصہباء کو مجہول قرار دینے سے طاؤس کی تکذیب ثابت کرنے میں جس غلط بیانی اور کج فہمی کا اظہار کیا ہے وحد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ لکھتے ہیں:

> اعتراض یہ ہے کہ جب ابوالصہباء مجہول ہیں اور موالی ابن عباس میں نہیں تو امام طاؤس (استاذ امام ابوحنیفہ) یہ کیسے کہتے ہیں کہ ابوالصہباء نے ابن عباس سے پوچھا۔ ناظرین انصاف اس کا منشاء اس کے سوا اور بھی کچھ ہے کہ طاؤس جو کچھ کہتے ہیں جھوٹھ[1] کہتے ہیں (نعوذ باللہ)

ناظرین، مجیب صاحب کی غلط بیانی دیکھیں کہ انھوں نے معترض کا اعتراض یہ بتایا کہ ابوالصہباء مجہول ہیں اور موالی ابن عباس میں نہیں ہے، حالانکہ آثار ص ۱۶ میں الجوہر النقی سے جو اعتراض انھوں نے نقل کیا ہے، اس میں نہ ابوالصہباء کا مجہول (باصطلاح محدثین) ہونا مذکور ہے نہ موالی ابن عباس میں سے ہونے کی مطلقاً نفی ہے، بلکہ یہ مذکور ہے کہ ابوالصہباء نام کا کوئی شخص ابن عباس کے غلاموں میں معروف نہیں ہے۔

اس کے بعد ان کی نافہمی ملاحظہ کریں، تھوڑی دیر کے لیے مانیے کہ معترض نے ابوالصہباء کو مجہول ہی کہا، اور مانیے کہ ابوالصہباء نام کا کوئی شخص موالی ابن عباس میں حقیقۃً نہیں ہے، تو بھی امام طاؤس کا جھوٹا ہونا لازم نہیں آتا۔ دیکھئے امام بخاری نے صحیح بخاری میں ذکر کیا ہے کہ جب ابوسفیان کی خبر وفات شام سے آئی تو حضرت ام حبیبہ نے تین دن سوگ کرنے کے بعد خوشبو کا استعمال کیا، اس مقام پر تمام محدثین لکھتے ہیں کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی وفات شام میں نہیں ہوئی بلکہ مدینہ میں ہوئی تو کیا مجیب صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ محدثین کے اس کہنے کا منشاء اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ امام بخاری یا ان کے استاذ یا استاذ الاستاذ وَھَلُمَّ جَرّاً نے جھوٹ بیان کیا، مجھ کو یقین ہے کہ مجیب صاحب یہاں پر یہ بات کہنے کی جرأت

---

(۱) آثار ص ۱۷ میں یونہی لکھا ہے ۱۲ منہ

نہیں کر سکتے بلکہ یہ کہیں گے کہ شام یا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا نام لینے میں کسی راوی سے وہم ہوگیا ہے پس اسی طرح ان کو سمجھنا چاہئے کہ حدیث نزاعی میں بھی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی راوی کو وہم ہوگیا ہے۔

علاوہ بریں اگر بفرض محال اعتراض مذکورہ بالا سے تکذیب ہی لازم آتی ہو تو طاؤس کی تکذیب کیوں متعین ہے یہ کیوں نہیں ہوسکتا کہ نیچے کے راویوں میں سے کسی کی تکذیب لازم آوے **(نعوذ بالله من سوء الفهم)**

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جس معترض کے اعتراض میں اس وقت گفتگو ہو رہی ہے اس نے ابوالصہباء کو اصطلاحی مجہول قرار نہیں دیا ہے لہذا مجیب صاحب نے ثانیاً اور ثالثاً اور رابعاً کے ماتحت جو کچھ لکھا ہے فضول و بے موقع اور ان کی نافہمی کا نتیجۂ بد ہے۔ اسی طرح میں نے بھی ابوالصہباء کو اصطلاحی مجہول نہیں لکھا ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ ابوالصہباء کی شخصیت مجہول ہے۔ جس کا مطلب ہر اردو داں سمجھ سکتا ہے، لیکن مجیب صاحب کو سمجھانے کے لیے لکھتا ہوں کہ اس سے میری مراد یہ ہے کہ اہل علم میں ان کو کوئی شہرت حاصل نہیں ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ مجیب صاحب نے اس بات کو ثابت کرنے میں کہ ابوالصہباء اس حدیث کے راوی نہیں ہیں صریح غلط بیانی اور تہذیب کی عبارت نقل کرنے میں خیانت سے کام لیا ہے لکھتے ہیں امام طاؤس یہ ذکر کرتے ہیں کہ میں ابوالصہباء اور ابن عباس کے مکالمہ میں موجود تھا۔ میری موجودگی میں ان دونوں حضرات میں یہ گفتگو ہوئی (آثار ص۱۹)

شاباش مجیب صاحب شاباش، جھوٹ بولے تو اس طرح بولے۔ میں آپ کو اور آپ کے اعوان وانصار کو چیلنج دیتا ہوں کہ کوئی ایسی روایت آپ لوگوں کی زنبیل میں ہو جس کا یہ ترجمہ ہوسکے کہ میں مکالمہ میں موجود تھا میری موجودگی میں گفتگو ہوئی تو پیش کیجئے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں تہذیب میں ہے **له ذكر في صحيح مسلم** اگر راوی ہوتے تو رواۃ مسلم میں ذکر کرتے (آثار ص۱۹) مجیب صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ حافظ ابن حجر کس طرح ذکر کرتے تو معلوم ہوتا کہ انھوں نے ابوالصہباء کو رواۃ مسلم میں ذکر کیا ہے، لیکن ابوالصہباء کی نسبت تقریب کے حوالہ سے جو بات مجیب صاحب نے لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راوی کے نام سے پہلے جو رموز لکھے ہیں ان سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ شخص فلاں فلاں کتاب کا راوی ہے پس اس اصول کی بنا پر ابوالصہباء کو مسلم کا راوی کہنا چاہئے اس لیے کہ ابن حجر نے تقریب اور

تہذیب دونوں میں ان کے نام سے پہلے م (یعنی صحیح مسلم) کا نشان دیا ہے۔ ایسا ہی خلاصہ میں بھی ہے اب رہا مجیب صاحب کا یہ کہنا کہ حافظ نے **لـه ذکر فی** صحیح مسلم لکھا ہے تو ناظرین کو معلوم ہونا چاہئے کہ مجیب نے یہاں کھلی ہوئی خیانت سے کام لیا ہے حافظ کی آدھی عبارت نقل کی آدھی چھوڑ دی ہے۔ پوری عبارت ملاحظہ ہو۔ **له ذکر فی صحیح مسلم فی حدیث داؤد عن ابی نضرة عن ابی سعید فی الصرف.** یعنی ابوالصہباء کا ذکر صحیح مسلم میں حدیث داؤد عن ابی نضرۃ عن ابی سعید میں ہے جو بیع صرف کے باب میں ہے۔ ہر صاحب نظر غور کرے کہ اس عبارت سے اگر ثابت ہوگا تو صرف اتنا کہ بیع صرف میں ابوالصہباء مسلم کے راوی نہیں ہیں۔ باقی اور کسی حدیث میں ان کے راوی ہونے کی نفی کہاں سے نکلتی ہے۔ اگر کہا جائے کہ دوسری حدیث کے راوی ہوتے تو ابن حجر اس مقام پر ذکر کرتے۔ تو میں کہوں گا کہ ابن حجر کے ذکر نہ کرنے سے اگر یہ لازم آتا ہے کہ ابوالصہباء مسلم میں کسی دوسری حدیث کے بھی راوی نہیں ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ دوسری کسی حدیث میں ان کا ذکر بھی نہیں آیا ہے حالانکہ یہ بالبداہت باطل ہے، مجیب صاحب تسلیم کر چکے ہیں کہ طلاق والی حدیث میں ابوالصہباء کا ذکر آیا ہے پس حافظ کے عدم ذکر سے ابوالصہباء کے راوی ہونے کی نفی ثابت کرنا غلط ہے۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب ابوالصہباء کے راوی ہونے کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے تو جس بزرگ نے یہ لکھا ہے کہ ''امام بخاری نے محض ابوالصہباء کی وجہ سے اس روایت کو اپنی صحیح میں درج نہیں کیا'' اس نے کوئی بے جا بات نہیں کہی۔ ہمارا یہ کہنا اس حالت میں ہے جب کہ کسی بزرگ نے یہ کہا بھی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی بزرگ نے ہمارے علم میں یہ بات نہیں کہی ہے۔ بلکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ امام بیہقی نے بعض حدیثوں میں اسی قسم کے الفاظ سے جیسے حدیث طاؤس میں ہیں بعض حضرات کا راوی ہونا سمجھا ہے اور اسی بنیاد پر اس میں کلام کیا ہے اور اس حدیث میں اس بنیاد پر کلام نہیں کیا اس لیے بعض بزرگوں نے الزاماً لکھا ہے کہ جب دوسری حدیثوں میں آپ یہ کلام کر چکے ہیں تو یہاں بھی اس کا احتمال موجود ہے۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

ثانیاً: — یہ روایت شاذ و منکر ہے چنانچہ امام احمد بن حنبل اور بیہقی نے یہی فرمایا ہے کہ ابن عباس کے جملہ شاگرد اس کے خلاف روایت کرتے ہیں دیکھو نیل الاوطار ۶ ص ۱۵۷ اور اعلام

الموقعین ۲ص۲۲ فتح الباری ج۹ص ۲۹۱)

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''اولاً بحوالہ الطیب الشذی، ظفر الامانی، ومقدمہ فتح الباری وغیرہ بتایا جاچکا ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی بابت تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ اس میں جتنی حدیثیں مرفوع متصل ہیں وہ قطعا بلا ریب صحیح ہیں، ....عدم شذوذ کی قید ضروری ہے پس اس حدیث کو شاذ کہنا صحیح مسلم کی حدیث کو غیر...... کہنا ہے اور ایسے شخص کے متعلق فتویٰ ہے کہ وہ بدعتی اور غیر مسلموں کی پیروی کرنے والا ہے۔

جواب:- پہلے مجیب صاحب کی غلط بیانیوں کو دیکھئے:

۱:-ظفر الامانی کی جو عبارت آثار ص۱۴ میں نقل کی ہے اس میں کہیں بھی یہ بات مذکور نہیں ہے جیسا کہ میں تھوڑا پہلے لکھ چکا ہوں۔

۲:-مقدمہ فتح الباری کی جو عبارت آثار ص۱۴ میں نقل کی ہے اس میں بھی یہ بات مذکور نہیں ہے۔

۳:-الطیب الشذی، ظفر الامانی اور مقدمہ کے علاوہ چوتھی کسی کتاب کا نام وہاں نہیں لیا ہے لہٰذا یہاں وغیرہ کا اضافہ بھی غلط بیانی سے خالی نہیں ہے۔

۴:-سب سے بڑی غلط بیانی صحیح کی تعریف میں عدم شذوذ (بمعنی عدم مخالف) کی قید کو ضروری بتانا ہے، حالانکہ حافظ ابن حجر نے بالکل صاف وواضح الفاظ میں لکھا ہے کہ صحیح کی تعریف میں کسی امام حدیث نے عدم شذوذ (بمعنی عدم مخالف) کی قید نہیں لگائی ہے، حافظ سیوطی تدریب الراوی میں حافظ ابن حجر کا قول نقل کرتے ہیں **ولم أر مع ذالک عن أحد من أئمة الحديث اشتراط نفي الشذوذ المعبر عنه بالمخالفة وانما الموجود من تصرفاتهم تقديم بعض ذلک على بعض في الصحة وامثلة ذلک موجودة في الصحيحين وغيرهما** (ص۱۵) یعنی میں نے ائمہ حدیث[1] میں سے کسی کو عدم شذوذ بمعنی عدم مخالفت کی شرط لگاتے نہیں دیکھا۔ بلکہ ان کے تصرفات میں تو بعض کی بعض پر تقدیم پائی جاتی ہے، اور اس کی مثالیں صحیحین

---

(۱) ائمہ حدیث سے مراد قدمائے محدثین بخاری ومسلم وغیرہ ہیں اور مخالفت سے **مخالفة الثقه لمن هو ارجح منه كما لا يخفى** ۱۲ منہ

وغیرہما میں موجود ہیں۔اسی کے قریب قریب فتح المغیث ص ۷ میں بھی ہے۔

اس کے بعد میں مجیب صاحب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ آثار ص۱۴ میں یہ مان چکے ہیں کہ دارقطنی نے بخاری ومسلم کی حدیثوں پر کلام کیا ہے،اور ابن حجر نے مقدمہ ص۴۰۲ میں تصریح کی ہے کہ دارقطنی نے جواعتراضات کیے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بخاری ومسلم کی بعض حدیثیں شاذ ہیں۔پس مجیب صاحب کی تحقیق عالی کی بنا پر دارقطنی بھی بدعتی اور غیر مسلموں کی پیروی کرنے والے ہوئے (توبہ توبہ) نیز مولانا مبارک پوری ومولانا ابوالمکارم وغیرہما بھی اس فتویٰ سے نہیں بچ سکتے **کما مر**۔

مجیب صاحب کو پہلے بھی سمجھا چکا ہوں اور پھر سمجھاتا ہوں کہ جولوگ بخاری ومسلم کی احادیث کی صحت پر اجماع نقل کرتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ یہ استثنا بھی ذکر کرتے ہیں کہ جس حدیث پر کسی قابل اعتماد حافظ حدیث نے گرفت کی ہو وہ اس حکم سے خارج ہے، چنانچہ امام ابوعمرو بن الصلاح کا کلام حافظ ابن حجر مقدمہ میں نقل کرتے ہیں **ما اخذ علیهما أی علی البخاری ومسلم قدح فيه معتمد فی الحفاظ فهو مستثنیٰ مما ذکرنا لعدم الاجما ع علی تلقيه بالقبول** یعنی بخاری ومسلم کی جن حدیثوں پر کسی معتمد حافظ نے کلام کیا ہو وہ اس حکم سے مستثنی ہے اس لیے کہ اس کی مقبولیت پر اجماع نہیں ہوا۔حافظ ابن حجر اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں **وهو احتراز حسن** یعنی یہ استثناء اچھا ہے۔اسی طرح اس استثنا کا ذکر سیوطی نے بھی تدریب الراوی میں کیا ہے،اور اسی کے قریب قریب حافظ ابن حجر نے شرح نخبۃ الفکر میں بھی لکھا ہے،نخبۃ الفکر کی عبارت یہ ہے **الا ان هذ المختص بما لم ينتقد ہ أحد من الحفاظ وبما لم يقع التجاذب بين مدلوليه حيث لا ترجيحلاستحاله** اور اس استثنا کا ذکر فتح المغیث میں بھی ہے۔

کہئے مجیب صاحب کیا یہ سب لوگ بدعتی اور غیر مسلموں کی پیروی کرنے والے ہیں؟ (معاذاللہ) حیرت ہے کہ مجیب صاحب نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ حدیث مسلم کو شاذ کہنے والے امام احمد وبیہقی ہیں،ان کا خصم نہیں ہے کہ جھٹ بدعتی ہونے کا فتویٰ دے دیا جائے۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

> ''ثانیاً شاذ کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی......ایک حدیث کو چند ثقات روایت کرتے ہیں اور اسی حدیث کو کوئی دوسرا ثقہ ان کے خلاف روایت کرتا ہے تو اس مخالف حدیث کو شاذ کہتے ہیں۔اور یہاں راوی اور روایت میں مخالفت ہے نہ کہ روایت روایت میں''

جواب: - خط کشیدہ عبارت مولانا عبدالحی کی اس عبارت **واما اذا خالف الثقة غیره من الثقات فهو شاذ** اور شیخ عبدالحق کی اس عبارت **وفی الاصطلاح ما روی مخالفا لما رواه الثقات** کا ترجمہ ہے۔

لیکن اہل علم غور فرمائیں کہ ان دونوں عبارتوں میں یہ کہاں مذکور ہے کہ ''اسی حدیث کو کوئی دوسرا ثقہ ان کے خلاف روایت کرے''۔ مجیب صاحب کو چاہئے کہ شاذ کی اس تعریف کے لیے کوئی دوسرا حوالہ پیش کریں۔

نوٹ: - مجھے یہاں مجیب صاحب کی پیش کردہ تعریف کے صحت وسقم سے بحث نہیں ہے، میرا منشاء صرف یہ ہے کہ جن حوالوں سے انھوں نے مذکورہ بالا تعریف اپنے الفاظ میں بیان کی ہے ان حوالوں سے وہ تعریف ثابت نہیں ہوتی۔ چنانچہ پہلی عبارت کا ترجمہ یہ ہے جب ثقہ ثقات میں سے اپنے غیر کی مخالفت کرے تو وہ شاذ ہے، اور دوسری عبارت کا ترجمہ یہ ہے اصطلاح میں (شاذ وہ ہے) جو مخالف روایت کی جائے اس چیز کے جس کو ثقات روایت کرتے ہوں۔

باقی آپ نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''یہاں راوی اور روایت میں مخالفت ہے نہ کہ روایت روایت میں''، تو شاید آپ کو معلوم نہیں کہ بیہقی نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ روایت ابن عباس سے دوسری روایتوں کے خلاف ہے۔ فرماتے ہیں **ترکه البخاری أظنه لمخالفته سائر الروایات عن ابن عباس** (یعنی میں سمجھتا ہوں کہ بخاری نے حدیث طاؤس کو اس سبب سے چھوڑ دیا ہے کہ وہ ابن عباس سے دوسری روایتوں کے خلاف ہے (زاد المعاد) اور امام احمد نے بھی ابن عباس کی دوسری روایتوں کے خلاف ہونے کی تصریح کی ہے، چنانچہ آپ خود آثار ص۲۰ میں ان کا یہ کلام نقل کرتے ہیں **بروایة الناس عن ابن عباس من وجوه خلافه** یعنی (میں نے حدیث طاؤس کو اس لیے چھوڑا کہ) ابن عباس سے لوگ اس کے خلاف متعدد طریق سے روایت کرتے ہیں۔ ان تصریحات سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ امام احمد اور بیہقی نے حدیث طاؤس کو ابن عباس کی دوسری روایات کے خلاف فرمایا ہے۔ اور آپ نے مولانا عبدالحی شیخ عبدالحق رحمہما اللہ کی جو عبارتیں نقل کی ہیں ان میں تصریح ہے کہ جو چیز ثقات کی روایت کے خلاف ہو وہ شاذ ہے۔ لہٰذا امام احمد و بیہقی کے نزدیک حدیث طاؤس بلا ریب شاذ ہے۔ پس امام احمد کی جانب شذوذ کی نسبت کو صریح خیانت اور افتراء قرار دینا، آپ کی کوتاہ فہمی و ناقص العقلی ہے۔

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ حسین بن معز بلخی بہاری ہندوستان کے مشہور مشائخ طریقت میں ہیں، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اور اپنے چچا شیخ مظفر سے خلافت پائی تھی، چچا کے ساتھ حجاز گئے، اور چار سال تک وہاں قیام کیا، تجوید وقرأت کی تحصیل وہیں کی، صحیح بخاری وصحیح مسلم کو حرفاً حرفاً اپنے چچا شیخ مظفر سے پڑھا۔

آپ کی وفات ۸۴۴ھ میں ہوئی۔

شیخ امین الدین لکھنوی بجنور (ضلع لکھنؤ) کے بزرگ عالم تھے، انھوں نے سات حج کیے تھے، حجاز سے واپسی میں گجرات پہنچ کر ان کا انتقال ہوگیا، لاش لکھنؤ لاکر دفن کی گئی، آپ کا سالِ وفات ۸۹۱ھ ہے۔

شیخ احمد کھتو شیخ عبدالحق نے لکھا ہے کہ وہ مشائخ گجرات میں سب سے بڑے ہیں، بابا اسحٰق مغربی کے خلیفہ ومجاز طریقت تھے، مظفر شاہ گجراتی کے عہد حکومت میں آپ نے احمد آباد سے چند میل کے فاصلہ پر قصبہ سرکھیج میں سکونت اختیار کی، مظفر شاہ کا پوتا احمد شاہ بانی احمد آباد آپ کا مرید تھا، احمد آباد آپ کی زندگی میں ۸۱۰ھ میں آباد ہوا ہے۔

آپ کا بیان ہے کہ یہ فقیر جب زیارت خانہ کعبہ کے ارادہ سے جہاز پر سوار ہوا تو ایک دن وضو کرنے میں اتفاق سے پاؤں پھسل گیا، اور یہ فقیر دریا میں جا پڑا۔ فقیر نے تیرنا شروع کیا اور برابر **یَاحَافِظُ یَاحَفِیْظُ یَا رَقِیْبُ یَا وَکِیْلُ یَا اَللّٰہُ** کا ورد کرتا رہا، تھوڑی دور تیرنے کے بعد پیروں کے نیچے ایک پتھر ملا، فقیر اس پر کھڑا ہوگیا، پانی کمر کے برابر تھا، میں نے ان اسماء کا ورد برابر جاری رکھا، اس کے بعد ناخدا اور ملاحوں نے مجھ کو مچھلی کی طرح سمندر سے نکالا۔

فرماتے ہیں کہ جب میں حج سے فارغ ہوکر مدینہ طیبہ روانہ ہوا، تو ساتھ میں امام

خانجہاں اور شیخ تاج الدین سرکھیجی اور ایک تیسرے شخص بھی تھے، جب ہم مسجد نبوی میں اترے تو ساتھیوں نے کہا کہ کھانا لانا چاہئے، میں نے کہا کہ میں تو حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہوں، وہ لوگ باہر گئے اور کھانے سے فارغ ہوکر آئے تو ساتھ ہی نماز عشا پڑھی گئی، وہ لوگ نماز پڑھ کر سو گئے اور میں ہاتھ دھو کر تسبیح پڑھ رہا تھا کہ ایک شخص نے آواز دی کہ حضرت کا مہمان کون ہے؟ میں نے سمجھا کوئی دوسرا ہوگا، پھر دوسری اور تیسری آواز آئی تو میں نے سمجھا کہ یہ آدمی مجھ ہی کو بلا رہا ہے۔

میں اٹھا اور اس کے سامنے گیا، دیکھا کہ ایک طبق ہاتھ میں لیے ہوئے ہے، مجھ کو دیکھ کر اس نے کہا حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھیجا ہے، میں نے دامن پھیلا دیا، اس نے کھجوریں میرے دامن میں ڈال دیں اور طبق لے لیا، ان کھجوروں کی لذت اور شیرینی کا بیان نہیں ہوسکتا۔

صبح کو سو کر اٹھا تو جو خواب میں نے دیکھا تھا، ان تین ساتھیوں نے بھی دیکھا تھا، خواب یہ تھا کہ ایک نہایت خوش فضا مقام میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تشریف فرما ہیں، اور آنحضرت ﷺ کے سامنے سونے کے زیوروں سے لدی ہوئی ایک عورت کھڑی ہے، حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ اس عورت کو قبول کر۔

فقیر نے عرض کیا کہ بابو (میرے پیر بابا اسحٰق) نے قبول نہیں کیا ہے، آنحضرت ﷺ نے حضرت علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بابو یہ ہیں، میں نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو حضرت علی کے پاس ذرا نیچے بابو (بابا اسحٰق مغربی[۱۲]) کھڑے ہیں، اور دانتوں تلے انگلی دبا کر فرماتے ہیں کہ بابا! حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فرمان ہے اس کو قبول کر، میں نے اس عورت کو قبول کرلیا۔

شیخ احمد کھتو فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ آیا، یہ عورت دنیا کی صورت مثالی تھی، اور آج جو ہمارے یہاں دنیا کی بہتات ہے وہ حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہے۔

شیخ عبدالحق نے لکھا ہے کہ شیخ احمد کی زندگی میں ان کے یہاں فقراء کا دسترخوان بڑا وسیع تھا، اور وفات کے بعد تو ان کی خانقاہ میں ایسا لنگر جاری تھا کہ امیر و بادشاہ بھی سیر ہوسکتے تھے، فقراء و مساکین کا کیا ذکر؟

شیخ احمد کھتو نے اپنے سفر حج کے واقعات کے سلسلہ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ مدینہ سے روانگی

کے وقت جب وہ اوران کے ساتھی آخری سلام پڑھنے کے لیے روضہ نبوی کے پاس حاضر ہوئے تو روضۂ پاک کے نگراں دس گز (ہاتھ) سیاہ کپڑا ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ یہ عمامہ سر پر باندھ لیجئے، میں نے کہا بابو (ان کے پیر) نے سر پر پگڑی نہیں باندھی ہے، بس ٹوپی پہنتے تھے، نگراں نے کہا، مجھ سے حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے (خواب میں) فرمایا ہے کہ اس شخص کو دس گز سیاہ کپڑا دینا اور کہنا کہ اس کو سر پر باندھو، اور خلق خدا کو دعوت دو، میں نے عمامہ لے کر آنکھوں پر رکھا، پھر سر پر باندھا۔

شیخ احمد کھتو کی وفات ۸۴۹ھ میں ہوئی، مزار مبارک سرکھیج میں ہے، اس ناچیز نے اس کی زیارت کی ہے، شیخ عبدالحق نے ان کے مقام مزار کی نسبت لکھا ہے: مقامیست بغایت لطیف ومنزہ ومصفاومروّح کہ نظائرآں برروئے زمین کم باشند (اخبارالاخیار، نزہۃ الخواطر)

مولانا عبدالرحمٰن جامی درس نظامی کی مشہور ومعروف کتاب شرح جامی کی بدولت آپ کے نام سے مدارس کا بچہ بچہ واقف ہے، شرح کافیہ کے علاوہ بزرگوں کے تذکرہ میں آپ کی کتاب نفحات الانس، اور آپ کی مثنویاں تحفۃ الاحرار وسبحۃ الابرار نیز سلسلۃ الذہب نہایت پاکیزہ اور مشہور کتابیں ہیں۔

آپ نہایت بلند پایہ عالم ہونے کے ساتھ بہت عالی مقام عارف وصوفی بھی تھے، مولانا سعدالدین کاشغری سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھے، اورانھیں سے خلافت بھی حاصل تھی۔

اس سلسلہ کے شہرۂ آفاق بزرگ خواجہ عبیداللہ احرار سے آپ کو بے پایاں عقیدت تھی، اور ان کی صحبت سے بھی فیضیاب ہوتے تھے، خواجۂ احرار کی مدح میں آپ کا یہ شعر، یوسف زلیخا پڑھنے والوں کو یاد ہوگا۔

چوں فقراندرلباس شاہی آمد　　　بتدبیر عبید اللّٰہی آمد

مولانا جامی شیخ کامل اور عارف صادق ہونے کے باوجود جلدی کسی کو مرید نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ تحمل بارشیخی ندارم (پیر بننے کا بوجھ مجھ سے نہ اٹھے گا) لیکن آخر عمر میں چاہتے تھے کہ کوئی طالب صادق ملے تو اس کی تربیت فرمائیں، فرماتے تھے کہ کوئی سچا طالب نہیں ملتا۔

مولانا جامی کی علمی جلالت کا شہرہ دور دور تک تھا، چنانچہ ٹرکی کے سلطان بایزید خاں نے

قاصد بھیج کر آپ کوٹر کی آنے کی دعوت دی، مگر آپ نے معذرت کر دی (شذرات)

اسی طرح دکن کے ملک التجار خواجہ محمود گاوان نے جب بیدر میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کیا تو اس کی صدارت کے لیے، مولانا جامی سے درخواست کی تھی، اور کہا جاتا ہے کہ مولانا آمادہ تھے، مگر کسی وجہ سے نہ آسکے (نزہتہ) مولانا نے اپنے اس شعر میں محمود گاوان ہی طرف اشارہ کیا ہے ۔

ہمرہ قافلۂ ہندرواں کن کہ رسد　　　شرف عز وقبول از ملک التجارش

مولانا جامی کا حج ایک تاریخی حج تھا، آپ نے وسط ربیع الاول ۸۷۷ھ میں جب حج کا ارادہ کیا تو خراسان کے بہت سے اکابر مانع ہوئے، اور عرض کیا کہ یہاں ہر روز آپ کی توجہ سے مسلمانوں کے ایسے اہم اہم کام انجام پاتے ہیں، جن میں ہر ایک کا ثواب پا پیادہ حج کے برابر ہوگا۔

مولانا نے مزاح کے انداز میں جواب دیا کہ جی ہاں، مگر چونکہ پیادہ پا حج کرتے کرتے بہت تھک گیا ہوں، اس لیے چاہتا ہوں کہ اب سواری سے حج کر آؤں۔

بہر حال مولانا ۱۶/ربیع الاول ۸۷۷ھ کو ہرات سے روانہ ہوئے، اور نیشا پور، سبزوار، بسطام، دامغاں، سمنان، اور قزوین ہوتے ہوئے ہمدان پہنچے، تو ہمدان کے حاکم شاہ منوچہر نے نہایت اخلاص و نیاز مندی سے آپ کا استقبال کیا، اور آپ کے پورے قافلہ کو تین دن تین رات اپنے یہاں مہمان رکھا، اور شاہانہ طور پر میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔

اس کے بعد ایک بڑی جمعیت کے ساتھ اس قافلہ کو بغداد کی سرحد تک پہنچانے آیا، تاکہ کردستان کے خطرناک علاقہ میں اہل قافلہ کو کوئی گزند نہ پہنچے، وسط جمادی الاخریٰ میں قافلہ بغداد پہنچا، چند دنوں کے بعد مولانا نے کربلا میں مشہد حضرت حسین کی زیارت کی، پھر بغداد لوٹ آئے۔

بغداد میں یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ فتحی نام ایک بد باطن جو اس سفر میں آپ کے ساتھ تھا، اس سے اور مولانا کے کسی خادم سے تیز تیز باتیں ہوگئیں، اس پر وہ بگڑ گیا، اور قافلہ کا ساتھ چھوڑ دیا، اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ از راہِ خباثت نفس بغداد کے رافضیوں سے ساز باز کیا، اور سلسلۃ الذہب کے چند اشعار کو ماقبل و مابعد سے الگ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ دیکھئے، یہ اشعار اسلامی عقیدہ کے خلاف ہیں۔

بات اتنی بڑھی کہ تحقیق واقعہ کے لیے ایک مجلس ترتیب دی گئی، جس میں قاضی حنفی وقاضی شافعی کے علاوہ حاکم بغداد اور امراء شریک تھے، اور جس مدرسہ میں یہ مجلس بلائی گئی تھی، اس کے بام ودر پر عوام وخواص کی بھیڑ جمع تھی، سلسلۃ الذہب پیش ہوئی اور جن اشعار پر فتنہ برپا کیا گیا تھا، اس کے آگے پیچھے کے اشعار پڑھے گئے۔

جب اصل حقیقت کھلی تو لوگ حیران رہ گئے، اس کے بعد سب کے سامنے نعمت حیدری سے جو بغداد کے رافضیوں کا سردار تھا، اور وہی اس فتنہ پردازی میں پیش پیش تھا، مولانا جامی نے دریافت کیا کہ تم کو شریعت کے رو سے ہم پر اعتراض ہے، یا طریقت کے رو سے، اس نے کہا دونوں حیثیتوں سے، مولانا نے فرمایا کہ اچھا یہ بات ہے تو پہلے حکم شریعت کے مطابق اٹھ اور اپنی مونچھ جس کو تو نے مدۃ العمر ہاتھ نہیں لگایا ہے، اس کو ترشوا، یہ کہنا تھا کہ مجلس سے چند آدمی اٹھے اور جب تک قینچی آئے ان لوگوں نے آدھی مونچھ کسی چھڑی پر رکھ کر چاقو سے کاٹ دی، اور آدھی قینچی سے کاٹی گئی۔

اس کے بعد مولانا نے اس کو اہل طریق کا بھی راندۂ درگاہ ثابت کر کے کہا کربلا جا اور وہاں جاکے توبہ کر کے آ، پھر مناظرہ کرنا، اس کے ساتھیوں میں ایک اور شخص تھا جس نے مولانا جامی کے اشعار کے ساتھ کچھ اپنے اشعار بھی ملا دیئے تھے، اس کی نسبت مجلس نے فیصلہ کیا کہ اس کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں پھرایا جائے۔

بغداد میں چار مہینے قیام کرنے کے بعد مولانا جامی نے حجاز کا رخ کیا، اور آخر شوال میں نجف پہنچے اور حضرت علی کے مزار کی زیارت کی، موقع پر آپ نے ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

قد بدا مشهد مولای أنیخوا جملی **کہ مشاہد شد ازاں مشہدم انوار جلی**

ذی قعدہ کے شروع میں یہاں سے رخت سفر بندھا، اور مدینہ کے لیے روانگی ہوئی، راستہ میں آپ نے ایک قصیدہ تصنیف کیا جو بہت سے معجزات نبوی کے بیان پر مشتمل ہے، اس کا دوسرا مطلع یہ ہے ؎

یارب مدینہ است ایں حرم کز خاکش آید بوئے جاں   یا ساحتِ باغ ارم، یا عرصۂ روض الجناں

۲۲؍دن کے بعد مدینہ منورہ پہنچے، اور روضۂ نبوی کی زیارت کرنے کے بعد مکہ روانہ ہوئے،

دس دن کے بعد ۶؍ذی الحجہ کو مکہ پہنچے، اور حج کے تمام مناسک اور شرائط وآداب بجالانے کے بعد ۱۵؍ ذی الحجہ کو شام کے لیے براہِ مدینہ روانہ ہوئے، راستہ میں ایک غزل کہی، جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

چو حلقۂ درِ کعبہ بصد نیاز گرفتم دعائے حلقۂ گیسوئے مشکبوئے تو کردم

۲۵؍ذی الحجہ کو مدینہ منورہ پہنچ کر دوبارہ روضۂ اطہر کی زیارت اور صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی سعادت حاصل کی، ۲۷؍کو وہاں سے کوچ کیا، اور محرم کے اخیر عشرہ میں دمشق پہنچے اور وہاں چالیس دن قیام کیا۔

اس مدت میں قاضی محمد خیفری سے احادیث کی سماعت کی، اور سند لی، قاضی صاحب نے نہایت خاطر داری، اور عزت واکرام کے ساتھ مہمان داری کا حق ادا کیا، ۴؍ربیع الاول کو دمشق سے رخصت ہوکر بارہ دن میں مولانا حلب آئے۔

وہاں کے اکابر نے بھی آپ کا بڑا اعزاز واکرام کیا، اور ہدیے پیش کیے، ۲۰؍ربیع الثانی کو حلب سے آگے بڑھے تو محمد بیگ تین سو سوار ساتھ لے کر کردستان اور خطرناک علاقوں میں قافلہ کی حفاظت کے لیے تبریز تک آپ کے ساتھ رہا۔

تبریز میں بھی اکابر علماء اور اعیان نے بہت پرُتپاک استقبال کیا، اور اعزاز واکرام کے ساتھ پورے قافلہ کو نہایت عمدہ مکانات میں ٹھہرایا، پھر اصرار کر کے مولانا کی ملاقات وہاں کے حاکم حسن بیگ سے کرائی۔

حسن بیگ نے شاہانہ ہدیے اور نذرانے پیش کیے، اور باصرار تمام درخواست کی کہ آپ اب تبریز ہی میں اقامت فرمائیں، مولانا نے والدہ کی سن رسیدگی کا بہانہ کر کے خراسان کی راہ لی، ۲۰؍جمادی الاولیٰ کو تبریز پہنچے تھے، اور ۶؍جمادی الاخریٰ کو وہاں سے چل کر ۱۸؍شعبان ۸۷۷ھ کو ہرات پہنچے، مرزا سلطان حسین اس وقت مرو میں تھا، آپ کی بخیریت واپسی کی خبر اس کو ملی تو اپنے خاص معتمدوں کے ہاتھ بہت سے تحفے، اور اظہار اخلاص ونیاز مندی پر مشتمل ایک خط بھیجا، جس کی ابتدا اس شعر سے کی تھی ۔

اھلا بمقدمک الشریف فانه فرح القلوب ونزھة الارواح

عین اسی وقت امیر نظام الدین علی شیر کا رقعہ بھی پہنچا، جس میں یہ رباعی درج تھی:

رباعی

انصاف بده اے فلک مینا فام　　تازیں دو کدام خوب تر کرد خرام
خورشید جہاں تاب تو از جانب صبح　　یا ماہ جہاں گرد من از جانب شام

مولانا جامی نے ۸۹۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔

ہم طالب علموں پر، شرح جامی کے واسطہ سے مولانا کا بڑا احسان ہے، اس لیے بے اختیار آپ کا تذکرہ طویل ہوگیا۔ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم

مولاؔنا جامی نے جب تک حج نہیں کیا تھا اس وقت تک وہ زیارت حرمین کے لیے بہت مضطرب اور بے چین تھے، ان کا دل شوق سے لبریز، اور اس تمنا میں ان کی آنکھیں اشک ریز تھیں، ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

کے بود یارب کہ رو در یثرب وبطحا کنم　　گہ بمکہ منزل وگہ در مدینہ جا کنم

اور سلسلۃ الذہب میں فرماتے ہیں:

کے بود کہ میان منبر وقبر　　کردہ صد چاک جیب خرقۂ صبر
گردِ آں منزل بہشت نشاں　　رفتہ بادیدۂ سر شک فشاں
کے بود کز برائے روز بہی　　خاطرِ پُر امید ودوست تہی
رو دراں قبلہ گاہ حشمت وناز　　پیش سینہ نہادہ دست نیاز
ومبدم در معنی سفتہ　　خالی از لاف دعوے گفتہ
أ نبيَّ اللّٰه، السلام عليک　　انما الفوز والفلاح لديک
بسلام آمدم جوابم دہ　　مرہمے بردل خرابم نہ
بس بود جاہ و احترام مرا　　یک علیک از تو صد سلام مرا

اور مولانا کی یہ تمنا جب پوری ہوئی، تو ان الفاظ میں حق تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر بجالائے

داد مرا نعمتِ توفیقِ حج　　مَن قَرَعَ الباب وَلَجَّ ولج
در حرم خویش مرا رہ نمود　　زنگ ظلام از دل گمرہ زدود

داد مرا در حرمِ خود مقام ساخت مرا طائف بیت الحرام

مولانا نے اس سعادت کے حصول کے بعد مناسکِ حج میں ایک منظوم رسالہ تصنیف فرمایا ہے، آخری اشعار اسی رسالہ سے لیے گئے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ بہرائچ میں میرے مطالعہ سے گذرا ہے، اس نسخہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں خانہ کعبہ، منیٰ اور عرفات وغیرہ کی قلمی تصویریں بھی دی ہوئی ہیں۔

۹۰۱ھ سے ۱۰۰۰ھ تک

مفتی ومورخ مدینہ نور الدین سمہودی علی بن عبداللہ نام تھا، حسنی سید تھے، مورخین ان کو امام ومقتدا کے اوصاف کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، ۸۴۸ھ میں بمقام سمہود (مصر) پیدا ہوئے، ابتداءً اپنے والد سے بہت کچھ پڑھا، پھر قاہرہ آکر شمس جوجری، جلال محلی، شرف مناوی، اور سعد الدین دیری وغیرہم کے پاس تکمیل کی، دیری وجوجری وبامی نے ان کو تدریس کی اجازت دی۔

۸۷۳ھ سے مدینہ مطہرہ میں سکونت اختیار کی، وہاں ابوالفرج مراغی سے بکثرت احادیث کی سماعت کی، اور مکہ میں متعدد محدثین سے جن میں نجم الدین عمر بن فہد بھی ہیں، حدیثیں سنیں، حرمین کے طلبہ نے آپ سے بہت فائدہ اٹھایا، مدینہ پاک کی تین تاریخیں لکھیں، جن میں پہلی جل گئی، دوسری کا نام الوفا اور تیسری کا خلاصۃ الوفا ہے، یہ دونوں مصر میں چھپ گئی ہیں، مدینہ منورہ کی ان سے بہتر تاریخ دیکھنے میں نہیں آئی۔

۸۷۶ھ میں ان کا قیام مکہ میں تھا، اس کے بعد بیت المقدس کی زیارت کر کے پھر مدینہ میں سکونت اختیار کی، اور آخر عمر تک وہیں مقیم رہے۔

سخاوی کا بیان ہے کہ اہل مدینہ میں شاید ہی کوئی ہو جس نے ان سے نہ پڑھا ہو، سخاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مختلف فنوں سے واقف امام ہیں، بحیثیت مجموعی، ان کی نظیر نہیں تھی۔

سمہودی کی وفات ۹۱۱ھ میں ہوئی۔

غائبانہ نماز جنازہ

از مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ

(مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند)

پیش نظر تحریر ماہنامہ ''دارالعلوم'' کے اگست ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی، اس سے غائبانہ نماز جنازہ کا مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے، اس نماز کو آج کل بہت زور وشور سے رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ یہ مسئلہ آج لوگوں کے علم میں لانے کی کوشش کی جائے۔ (ادارہ)

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یہاں یہ مسئلہ طے ہے کہ غائب کی نماز جنازہ نہیں ہے، البتہ امام شافعیؒ اسے درست قرار دیتے ہیں، حنفیہ کے نزدیک میت کی موجودگی نماز جنازہ کے لیے شرط ہے، تمام فقہاء اس کی صراحت کرتے ہیں۔

ابن الہمام لکھتے ہیں:

وشرط صحتها إسلام الميت وطهارته ووضعه أمام المصلي فلهذا القيد لا يجوز على غائب (فتح القدیر ص۸۰ ج۲)

نماز جنازہ کے درست ہونے کے لیے میت کا مسلمان ہونا، پاک ہونا، اور امام کے سامنے ہونا شرط ہے، لہٰذا اس قید کی وجہ سے غائب کی نماز جنازہ درست نہیں ہوگی۔

حدیث میں بے شک یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی شاہِ حبش کی نماز جنازہ پڑھی، حالانکہ نجاشی کی نعش بظاہر موجود نہیں تھی، اور جو غائبانہ نماز کے قائل ہیں، ان کی دلیل بھی یہی حدیث ہے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے فقہاء احناف کہتے ہیں، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی، اس لیے کہ دوسری حدیث میں صراحت موجود ہے کہ نجاشی کا جنازہ آپ کے سامنے کر دیا گیا تھا اور آپ اُسے دیکھ رہے تھے، گو صحابہؓ کی آنکھیں دیکھ نہیں رہی تھیں، اور یہ درست ہے کہ اگر امام کے سامنے

جنازہ موجود ہے، اور وہ دیکھ رہا ہے، گو مقتدی نہ دیکھ رہے ہوں، تو بھی نماز جنازہ درست ہے۔

خود حافظ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے:

عن ابن عباسؓ قال: كشف للنبي ﷺ عن سرير النجاشي حتى رآه وصلّى عليه (مرقاة ص ۳۵۵ ج ۲)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نجاشی کا جنازہ آنحضرت ﷺ کے سامنے کردیا گیا، یہاں تک کہ آپؐ نے اسے دیکھا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

چنانچہ امام ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وأما صلاته عليه السلام على النجاشي كان إما لأنه رفع سريره له حتى رآه عليه السلام بحضرته فتكون صلاة من خلفه على ميت يراه الإمام وبحضرته دون المأمومين وهذا غير مانع من الاقتداء. (فتح القدیر ص۸۰ ج۲)

آں حضرت ﷺ نے نجاشی کی نماز جنازہ اس لیے پڑھی کہ وہ چارپائی آپ کے سامنے کردی گئی جس پر اُس کی نعش تھی، اس طرح کہ آپ نے اسے اپنے سامنے دیکھا، لہٰذا آپؐ کے پیچھے جن لوگوں نے نماز پڑھی، وہ ایسے جنازہ کی نماز ہوئی، جسے اُن کا امام دیکھ رہا تھا اور مقتدی نہیں دیکھ رہے تھے۔

آگے لکھتے ہیں، اس احتمال کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے، جسے ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں عمران بن الحصینؓ سے نقل کیا ہے:

انه عليه السلام قال: إن أخاكم النجاشي توفى فقوموا صلُّوا عليه فقام عليه السلام وصفّوا خلفه فكبر أربعاً وهم لايظُنون إلاأن جنازته بين يديه (فتح القدیر)[1]

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے بھائی نجاشی کی وفات ہوچکی ہے، آؤ اس کی نماز جنازہ پڑھو، چنانچہ خود آپؐ آگے کھڑے ہوئے اور صحابہؓ نے پیچھے صف باندھی اور آپؐ نے چار تکبیریں کہیں، اور وہ لوگ آپ کے سامنے جنازہ بظاہر نہیں دیکھ رہے تھے۔

---

(۱) اس سے زیادہ صاف اور صریح الفاظ مسند ابن الحامض میں ہیں۔ المنتقى من حديث ابن الحامض کے صفحہ ۸۷ پر حدیث نمبر ۱۶ کے الفاظ یہ ہیں: إنَّ أخَاكم النَّجَاشيَّ قد مات، فصلُّوا عليه، فقام رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وقُمنا فصلَّينا خلْفَهُ، فصلّى عليه مانرى إلا أنَّ الجنازةَ موضوعةٌ بينَ يدَيه اور مسند احمد کی روایت میں حدیث کا آخری ٹکڑا یہ ہے: وما نحسب الجنازةَ إلا موضوعةً بين يديه. اور شرح مشکل الآثار میں ہے: ونحن نرى أن الجنازة قد أتت. ان تمام روایتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحابہ کا یہ خیال تھا کہ جنازہ آپؐ کے آگے موجود ہے (مسعود احمد)۔

اس حدیث کونقل کر کے لکھتے ہیں:

فھذا اللفظ یشیر إلی أن الواقع خلاف ظنھم (فتح القدیر ص۸۰ ج۲)

اس لفظ سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ ان کے خیال کے خلاف تو ضرور پیش آیا۔

ماحصل یہ ہے کہ ہوا یہی کہ نجاشی کا جنازہ آنحضرت ﷺ کے سامنے کر دیا گیا، اور صحابہؓ اسے نہیں دیکھ رہے تھے، مگر آپؐ سے یہ سن کر انھوں نے یقین کر لیا تھا کہ بات وہی ہے جو آپ فرما رہے ہیں۔

تمام احادیث کو سامنے رکھنے کے بعد یہ فیصلہ آسان ہو جاتا ہے کہ جن کا جنازہ آپ کے سامنے کر دیا گیا، ان کے سوا آپ نے کسی اور کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، ورنہ کون نہیں جانتا ہے کہ آپ کی زندگی میں دور دراز شہروں میں دوسرے بہت سے صحابۂ کرامؓ نے وفات پائی، اور آپؐ نے ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، حالانکہ خود آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تم میں سے کسی کو سفر آخرت پیش آئے، اُس کی مجھے اطلاع دو، تا کہ میں اس کی نماز جنازہ پڑھوں، اور اس طرح مرنے والے کو سکون ہو۔

وکان صلی اللّٰہ علیہ وسلم یصلی الصلوۃ علی کل من توفی من الصحابۃ حریصاً حتی قال لا یموتن احدکم الا آذنتمونی بہ فان صلاتی علیہ رحمۃ لہ. (مرقاۃ ص۳۵۵ ج۲)

آنحضرت ﷺ ان تمام صحابۂ کرامؓ کی نماز جنازہ بڑے اشتیاق سے پڑھتے تھے جن کی وفات ہوتی، چنانچہ آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تم میں سے کسی کی وفات ہو، مجھے خبر کرو، اس لیے کہ میری نماز ان کے لیے سراپا رحمت ہے۔

اخیر میں مفتی اعظم، عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن قدس سرہ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

سوال:- جنازہ کی نماز غائبانہ پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:- غائبانہ جنازہ کی نماز پڑھنی درست نہیں ہے اور آنحضرت ﷺ نے جو نجاشی کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی تھی، تو جنازہ نجاشی کا سامنے کر دیا گیا تھا، یا وہ خصوصیت تھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی، دوسروں کے لیے یہ جائز نہیں ہے (کذا فی الدر المختار)

(دیکھئے مدلل ومکمل فتاوی دارالعلوم جلد پنجم)

جس عبارت کا مفتی علام رحمۃ اللہ علیہ نے حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

فلا تصح علی غائب غائب کی نماز جنازہ درست نہیں ہے

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار باب الجنائز. ص ۸۱۳ ج ۱)

امید ہے اس مختصر تحریر سے مسئلہ کے سارے پہلو سامنے آجائیں گے، اور کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۷۵ کا بقیہ

وہ پہلے سے ذات گرامی پر روشن و واضح ہے، بلاشبہ احقر اپنے احساسات کی روشنی میں ان صبر آزما لمحات کی شدت کو بخوبی سمجھتا ہے کہ چند سال قبل اس جانکاہ صدمے سے بذات خود دوچار ہو چکا ہے کہ یہ بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتا، بس جان ناتواں کو اسے جھیلنا ہی پڑتا ہے، مشیت ربانی کے سامنے اطاعت امر لازم بھی ہے اور امر مطلوب بھی۔

حق تعالی اس مرحلۂ عمر میں زندگی بھر کی اس رفاقت کے انقطاع کو آسان اور لائق تحمل بنائے، اور ابھی دیر تک جناب کے فیوض علمیہ سے تشنگان علم کو مستفیض ہوتے رہنے کی سعادت بخشے۔

دارالعلوم میں پورے اہتمام کے ساتھ ختم قرآن و ایصال ثواب کرادیا گیا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مرحومہ کے درجات بلند فرمائے، ہم سب خدام دارالعلوم کی جانب سے مضمون تعزیت پیش ہے، والسلام۔

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

تحریر: حمد محمد العریان ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی، شارجہ

پیش نظر تحریر ایک علمی مقالہ ہے، جو ایک عربی رسالے مجلة کلیة الآداب جلد ۵ سنہ ۱۹۷۷/ ۱۹۷۸ء میں پہلے پہل شائع ہوا تھا، بعد میں مستقل رسالہ کی صورت میں شائع ہوا، اس میں بہت اہم تاریخی واقعوں کا علمی و تحقیقی تجزیہ کیا گیا ہے۔

اس رسالہ کے مؤلف ڈاکٹر حمد العریان جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ہیں، اور ترجمہ کی خدمت سرپرست المآثر حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے صاحبزادے مولانا ازہر رشید الاعظمی - مقیم شارجہ - نے انجام دی ہے۔

امید ہے کہ اس تحریر سے بعض اہم تاریخی واقعات کو سمجھنے میں مدد ملے گی (ادارہ)

یزید بن معاویہ کے عہدِ حکومت میں مدینہ کی بے حرمتی اور خانۂ کعبہ کی آتشزنی قدیم اور جدید مآخذ کی روشنی میں

مقدمہ

خلاصۂ مضمون

میں اپنے اس مضمون میں دو ایسے واقعات سے بحث کروں گا، جو بنوامیہ کے دورِ حکومت میں پیش آنے والے اسلامی تاریخ کے سنگین ترین واقعات میں شمار ہوتے ہیں۔

اولاً: یزید بن معاویہ کے دورِ حکومت میں بنوامیہ کی فوج کے ہاتھوں تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی

عصر حاضر کے مورخین میں کوئی ایک مورخ بھی ہم کو ایسا نہیں نظر آتا جس نے مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کا خالص علمی جائزہ لیا ہو، اور اس واقعہ کے تمام آخذ اور اس کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا ہو، اگرچہ وہ سب کے سب اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ یہ واقعہ بالفعل رونما ہوا ہے، مگر ایسے تشفی بخش تاریخی شواہد کو پیش کرنے میں بالکل ناکام رہے ہیں جن کی بنا پر انھوں نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے، لہٰذا اس حادثہ کے واقع ہونے کا ثبوت ہنوز مشکوک ہے۔

ثانیاً: خانۂ کعبہ کی آتشزنی کا واقعہ۔اس کا الزام بھی بنوامیہ کی فوج کے سر ہے، جو یزید کے ہی دورِحکومت میں پیش آیا ہے

مدینہ کی سہ روزہ بے حرمتی کے الزام ہی کی طرح بنی امیہ کے لشکر پر خانۂ کعبہ کی آتشزنی کا الزام بھی ایک ایسا الزام ہے، جس کی بنیاد کسی ایسے قطعی اور ٹھوس دلائل پر قائم نہیں ہے جن میں کسی شک کی گنجائش نہ ہو،اس کے باوجود ہمیں معاصر مورخین میں بیشتر ایسے مسلمان اور مستشرق مورخ ملتے ہیں،جنھوں نے ان دونوں واقعات سے متعلق قدیم اور اولین مورخوں کی تحریروں کو اس طرح قبول کر لیا ہے جیسے وہ اٹل حقائق ہوں جس کی وجہ سے بیشتر نئی تحقیقات مبنی بر انصاف نہیں ہیں۔ یہ چیز ہمیں عنقریب اس وقت محسوس ہوگی جب ہم ان دونوں واقعات کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیں گے اور ہر ایک سے متعلق بنیادی مآخذ اور معاصر مورخوں کی تحریروں کے درمیان موازنہ کریں گے۔

تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی:

متعدد بنیادی مآخذ اور حوالہ جات کی کتابوں میں نیز بہت سی نئی کتابوں میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

حرہ کے واقعہ میں، مدینہ کے انقلابیوں کی شکست کے بعد حکومت کے فوجی کمانڈر مسلم بن عقبہ نے یزید کے اس حکم کو نافذ کر دیا،جس میں اس نے اپنی فوج کے لیے تین دن اور تین رات تک مدینہ کی بے حرمتی کرنے کی اجازت دی تھی تا کہ فوج وہاں اودھم مچائے قتل کا بازار گرم کرے،اور لوگوں کے مال ومتاع کو لوٹے۔بعض نے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ: فوجیوں نے عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا،اور ان کی آبروریزی کی، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیٹی کی شادی کرتا تو اس کی دوشیزگی کی ضمانت نہیں دیتا،اور یہ کہہ دیتا کہ ہوسکتا ہے کہ اس کی دوشیزگی واقعۂ حرہ میں زائل ہوگئی ہو۔

اس واقعہ کی عمومی تصویر یہی ہے، اگرچہ بعض مآخذ اور نئی کتابیں اس واقعہ کی تفصیلات میں باہم مختلف نظر آتی ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ کس حد تک واقعہ کی اس صورت کی تصدیق کی جاسکتی ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب ہم بنیادی مآخذ کی جانب رجوع کر کے جاننا چاہیں گے، کیونکہ بنیادی مآخذ ہی حقیقت کی تلاش کے لئے ہم سب کا مرجع ہیں۔

مدینہ کی بے حرمتی مآخذ کے آئینے میں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''تاریخ طبری'' ان مآخذ میں سرفہرست ہے، چنانچہ باتفاقِ مورخین تاریخ طبری بالخصوص بنی امیہ کے دور کی تاریخ کا اولین ماخذ ہے، کیونکہ اس کتاب کے مصنف کو ایک ممتاز علمی مقام حاصل ہے، اور انھیں یہ شہرت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی وسیع معلومات کے مطابق مختلف روایتوں کو مع ان کے راویوں کے ناموں کے پوری امانت کے ساتھ ہم تک پہنچا کر اپنی روایت کی ذمہ داری سے دستبردار ہو جاتے ہیں، اور ان روایتوں اور ان کے راویوں کی شخصیات کی تحقیق اور چھان بین کی ذمہ داری ہم پر ڈال دیتے ہیں۔اسی لیے ان روایتوں کی روشنی میں حکم صادر کرنے کی ذمہ داری ہمارے اوپر عائد ہوتی ہے۔طبری (وفات: ۳۱۰ھ) خود اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی اس کتاب میں ماضی کے جو واقعات ذکر کیے ہیں، اگر ان میں کسی واقعہ کی قاری مذمت کرتا ہے، یا سامع اس کو برا سمجھتا ہے، کیوں کہ وہ اس واقعہ کے صحیح ہونے کی نہ کوئی معقول وجہ جانتا ہے، اور نہ اس واقعہ کی حقیقت کا کوئی مطلب سمجھتا ہے، تو اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ واقعہ ہماری طرف سے ذکر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ وہ اس کے بعض راویوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔''(۱)

حرہ کے واقعہ اور مدینہ کی بے حرمتی سے متعلق طبری کی بیان کردہ روایتوں میں سے پہلی روایت ابومخنف لوط بن یحیی الازدی کی سند سے بیان کی گئی ہے، جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''... یہ لشکر یزید کے پاس سے (مدینہ) پہنچا، ان کا سپہ سالار مسلم بن عقبہ تھا۔ یزید نے اس سے کہا تھا: کہ اگر تجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو فوج کے لیے اپنا جانشین حصین بن نمیر السکونی کو بنا دینا، اور اس سے مزید کہا کہ: تین مرتبہ لوگوں کو دعوت دینا، اگر تمھاری بات مان لیں تو انہیں چھوڑ دینا ورنہ ان سے جنگ کرنا، اور جب تم ان پر غالب آ جاؤ تو مدینہ کی حرمت کو تین دن تک حلال کر دینا، اور وہاں جو مال و دولت ہو یا اسلحے اور کھانے کا ڈھیر ہو وہ سب فوج کا ہوگا۔''(۲)

''... پھر ان کو مسلم بن عقبہ نے دعوت دی اور کہا: اے مدینہ والو! امیر المومنین یزید بن معاویہ کا یہ خیال ہے کہ تم ہی عالی نسب ہو، اور میں تمھارا خون بہانا نہیں چاہتا، بلکہ تمھیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں''۔

''اور مسلم نے مدینہ کی تین دن تک بے حرمتی کی جس کے دوران فوج لوگوں کو قتل کرتی رہی،

(۱) الطبری: ۴۹۱/۵ (۲) ایضاً: ۴۹۱/۵

ان کا مال واسباب لوٹتی رہی، اس واقعہ نے وہاں کے صحابۂ کرام کو بھی خوفزدہ کر دیا۔''[۱]

یہ ہے وہ روایت جسے ابومخنف نے تاریخ طبری میں مدینہ کی بے حرمتی سے متعلق روایت کیا ہے، اور بظاہر یہی روایت ہر اس مورخ کا تنہا ماخذ ہے جس نے مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کو حقیقت تسلیم کیا ہے۔

حالانکہ ابومخنف کی شخصیت ایسی ہے جسے اسماء رجال کی کتابوں کے مصنفین کا اعتماد حاصل نہیں ہے، چنانچہ اس کی نسبت حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ: ''ابومخنف گرا پڑا تاریخ دان ہے، جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ابوحاتم وغیرہ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں: وہ ضعیف ہے۔ ابن معین کہتے ہیں: وہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ: کٹر شیعہ اور شیعوں کا مورخ ہے''۔[۲] پس نا قابلِ اعتماد ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر شیعہ ہونے کا الزام بھی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی روایتوں میں شیعوں کی جانب داری کا احتمال ہوسکتا ہے۔

بلکہ جناب محبّ الدین الخطیب نے تو اس کو طبری کے نا قابلِ اعتماد مآخذ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔[۳] عبدالمنعم ماجد اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ان شیعوں میں سے ہے جو علویوں کے حق میں بڑے پُر جوش ہیں۔[۴] اور دوسرے تمام مورخین کا ابومخنف کی نسبت اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ تاریخ طبری کے عراقی مدرسہ (رواۃ) کا سربراہ ہے۔[۵]

ابومخنف کا حال جب یہ ہے تو اب ایک محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی روایتوں کو تحقیق اور دوسری روایتوں سے موازنہ کیے بغیر تسلیم نہ کرے، بالخصوص جبکہ اس کی روایتوں کا تعلق ایسے واقعات سے ہو جو بنی امیہ کے عہد میں پیش آئے ہیں، اور اس میں بھی بطورِ خاص یزید کے عہدِ حکومت میں پیش آنے والے واقعات، کیونکہ یزید کی شخصیت عام شیعوں کے نزدیک بھی قابلِ نفرت ہے، تو جب مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کا ابومخنف ہی تنہا راوی ہے، تو اس کی حیثیت کیا ہوگی؟

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ خود طبری بھی اس واقعہ کی سنگینی کی وجہ سے ابومخنف کی روایت کو (اس کے ثبوت کے لیے) کافی نہیں سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابومخنف کی اس روایت کے علاوہ دیگر روایتیں بھی مذکور ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں: ''واقعۂ حرہ اور ابن غسیل کے قتل کے

(۱) الطبری: ۴۹۱/۵ (۲) الذہبی، القسم الثالث، ص، ۴۱۹-۴۲۰ (۳) الخطیب، مقالہ-ص، ۲۱۱
(۴) عبدالمنعم ماجد: ۲۶/۱ (۵) نبیہ عاقل، ص، ۱۱۲

سلسلے میں جو بات ابومخنف کے ذریعہ سے نقل کی گئی ہے، اس کے سوا دوسری بات بھی ان لوگوں کے ذریعہ ذکر کی گئی ہے جن سے یہ واقعہ روایت کیا گیا ہے۔"(۱)

پھر انھوں نے وہب بن جریر کی وہ روایت نقل کی ہے جس میں انھوں نے دمشق آنے والے اہل مدینہ کے وفد کے ساتھ یزید کے عزت واحترام سے پیش آنے کے واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ لیکن یزید کی جانب سے اپنے سپہ سالار مسلم کو تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی سے متعلق دیے جانے والے حکم کا ذکر بھی نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اتنا کہا ہے کہ: "اہلِ مدینہ کو شکست ہوئی تو جو لوگ خندق میں پھنس کر ہلاک ہوئے، ان کی تعداد ان لوگوں سے زیادہ تھی جو قتل کیے گئے، پھر وہ لوگ مدینہ میں داخل ہوئے اور لوگوں کو شکست دی،۔۔۔ اور مسلم بن عقبہ مدینہ میں داخل ہوا تو اس نے لوگوں کو یزید کی بیعت کی دعوت اس شرط کے ساتھ دی کہ وہ یزید بن معاویہ کے غلام ہیں، وہ ان کے جان ومال میں جو چاہے گا فیصلہ کرے گا۔"(۲)

اس واقعہ سے متعلق طبری کی ذکر کردہ ایک تیسری روایت بھی ہے جو ابومخنف کی روایت سے مختلف ہے، اور وہ عوانہ بن الحکیم کی روایت ہے۔ عوانہ بن الحکیم وہ راوی ہے، جس کی طبری نے کثرت سے روایتیں نقل کی ہیں، اور یہ راوی بظاہر غیر جانبدار لگتا ہے، کسی خاص جماعت کی طرف اس کا جھکاؤ محسوس نہیں ہوتا، چنانچہ اس سے بہت سی ایسی روایتیں مذکور ہیں جن میں اموی لہجہ نظر آتا ہے، جبکہ بہت سی ایسی عراقی اور مدنی روایتیں بھی ہیں جن میں بنی امیہ کی مخالفت کرنے والی جماعتوں کی آراء کا عکس نظر آتا ہے۔(۳)

بہر کیف عوانہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مسلم بن عقبہ نے قبا میں لوگوں کو - یزید کے لیے - بیعت کی دعوت دی تو انھوں نے بیعت کر لی، اور مسلم نے صرف بیعت کی مخالفت کرنے والوں اور شور و ہنگامہ کرنے والوں کو قتل کیا۔(۴)

دیکھئے وہب بن جریر اور عوانہ بن الحکیم کی بیان کردہ روایتوں میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ یزید نے مسلم کو تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی کا حکم دیا تھا، اس لیے تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی کا قصہ ایک ایسا افسانہ ہے جس کی حقیقت مشکوک ہے، اور اس ماخذ میں تو عورتوں کو قیدی بنانے اور

(۱) الطبری: ۴۹۵/۵ (۲) ایضاً (۳) الدوری: ص، ۳۷
(۴) الطبری: ۴۹۵/۵، نبیہ عاقل: ۱۲۲

ان کی آبروریزی سے متعلق سرے سے کسی بات کا تذکرہ ہی نہیں ہے۔

اسی لیے نیا مورخ جب مدینہ کی بے حرمتی والے واقعہ کو ثابت کرنے کے لیے طبری پر اعتماد کرتا ہے، تو درحقیقت وہ اس واقعہ کی ذمہ داری طبری ہی پر ڈالتا ہے، جبکہ وہ صرف ابومخنف کی روایت پر اعتماد کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ طبری کا حوالہ دے دینے سے اس کا کام ختم ہو گیا، اور طبری نے دوسری روایتیں جو نقل کی ہیں ان سے چشم پوشی کرتا ہے۔ اور یہ منہج اور طریقہ قابلِ قبول نہیں ہے۔

دوسرا ماخذ:- ابن اثیر (وفات: ۶۳۰ ھ) کی کتاب ''الکامل فی التاریخ'' ہے، اس کتاب نے کم از کم بنوامیہ کی تاریخ سے متعلق اپنے ماخذ کی تلاش کی زحمت سے ہمیں بچا لیا ہے، چنانچہ اس کتاب کے مصنف اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''میں نے امام ابوجعفر طبری کی تاریخ کی عظیم الشان کتاب سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے، اس لیے کہ تمام مورخین کے نزدیک یہ کتاب قابل اعتماد بھی ہے، اور اختلاف کے وقت مرجع بھی، چنانچہ میں نے اس کتاب کی تمام روایتوں کو مع ان کے رجال و رواۃ کے لیا ہے، اور کسی راوی کے ساتھ میں نے کوتاہی نہیں برتی ہے، امام طبری نے اکثر و بیشتر واقعات میں متعدد روایتیں ذکر کی ہیں، اور ہر روایت پہلی روایت کی طرح یا اس سے کم درجے کی ہے، بسا اوقات انھوں نے معمولی چیزوں کا اضافہ یا کمی بھی کی ہے، میں نے ان میں مکمل ترین روایتوں کو سامنے رکھتے ہوئے انھیں کو نقل کیا ہے''۔(۱) پس ابن اثیر کا ماخذ طبری ہی ہے، چنانچہ انھوں نے اس کے علاوہ دوسری کسی کتاب کا اپنے مقدمے میں ذکر بھی نہیں کیا ہے، نیز انھوں نے ہمیں اپنے انتخاب کا طریقہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ طبری کی مکمل ترین روایت کو قبول کرتے ہیں، اور یہی ان کے انتخاب کا سبب بھی ہے، اس لیے ابن اثیر کا طبری کی کسی روایت کو نقل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ روایت ان کے نزدیک صحیح بھی ہے، جیسا کہ خود انھوں نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔

اب یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ابن اثیر نے طبری ہی سے -جو ان کا اولین ماخذ ہے- ابو مخنف کی روایت نقل کی ہے، بلکہ انھوں نے مدینہ کی بے حرمتی سے متعلق واقعہ کو بعینہٖ طبری کے الفاظ میں یوں نقل کیا ہے: ''اور مسلم نے تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی کی، اس کی فوج لوگوں کو تہ تیغ کرتی اور ان کا مال و اسباب لوٹتی رہی، اس حادثے نے مدینہ کے صحابہ کرامؓ کو بھی سراسیمہ کر دیا''۔(۲) لیکن انھوں نے ابومخنف کی ذکر کردہ اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ یزید نے مسلم بن عقبہ کو اہل مدینہ کی

---

(۱) ابن الاثیر: ۵/۱ (۲) ابن الاثیر: ۳۱۳/۳

شکست کے بعد مدینہ کی بے حرمتی کا حکم دیا تھا، اسی طرح انھوں نے بے حرمتی کے دوران آبروریزی کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جیسا کہ بعض نئے مؤرخین نے ابن اثیر سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

غرض یہ ماخذ نہ تو طبری کا بدل بن سکتا ہے، نہ یہ تنہا مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کو طبری کی طرف رجوع اور اس کی روایتوں کی تحقیق کیے بغیر ثابت کر سکتا ہے، بالخصوص جب کہ ابن اثیر کا زمانہ اس دور کے واقعات کے بعد کا بھی ہے۔

تیسرا ماخذ: -جس کے بکثرت حوالے بغیر کسی احتیاط کے بعض معاصر مؤرخین کے یہاں ہمیں نظر آتے ہیں، وہ ہے: ''تاریخ الیعقوبی، وفات: ۲۸۴ھ''۔

مصنف کا اپنی تاریخ میں شیعوں کی روایتوں کی ترجیح کے سلسلہ میں شیعی رجحانات کے انکشاف (۱) اور شیعی عقائد کا پر جوش حامی ہونے، اور اپنے ائمہ کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالنے اور ان کے اقوال کو بکثرت نقل کرنے کی بنا پر (۲) کہ یہ چیزیں اس کی کتاب کی سطروں سے روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہیں (۳) یعقوبی کے ساتھ انتہائی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے، بالخصوص جب اس کا تعلق بنو امیہ کے واقعات سے، اور بنو امیہ میں بھی بطور خاص یزید کے عہد سے ہو۔

چوتھا ماخذ: -مسعودی: (وفات ۳۴۶ھ) کی کتاب ''مروج الذہب'' ہے، اس کے باوجود کہ بعض معاصر مؤرخین مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کو ثابت کرنے کے لیے بطور ماخذ کے مسعودی پر اعتماد کرتے ہیں۔ مگر ہمیں اس کی کتاب میں اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی، مسعودی نے صرف یہ لکھا ہے کہ: ''مسلم نے لوگوں سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ یزید کے غلام ہیں، اور جس نے اس سے انکار کیا اس کو تہ تیغ کر دیا''۔ (۴)

بعض دوسرے مآخذ جن میں اس واقعہ سے تعرض کیا گیا ہے، اور جن پر بعض مؤرخین نے اعتماد بھی کیا ہے، ان میں سے ایک اہم ''کتاب الامامۃ والسیاسۃ'' ہے، جس کی نسبت ابن قتیبہ کی طرف کی جاتی ہے، قابل حیرت وافسوس امر یہ ہے کہ بعض معاصر مؤرخین اس کتاب پر اس طرح اعتماد کرتے

(۱) روزنتھال: ص، ۱۸۴ (۲) حسن ابراہیم حسن: ۳/ ۵۸۱
(۳) عبدالمنعم ماجد: ۱/ ۲۷ (۴) المسعودی: ۳/ ۶۹-۷۱

ہیں جیسے واقعۃً ابن قتیبہ ہی اس کتاب کا مصنف ہو، حالانکہ وہ حتمی طور پر یہ جانتے ہیں کہ ابن قتیبہ کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح نہیں ہے، اس کے بارے میں ابن العربی (وفات: ۵۴۳ھ) اپنی کتاب ''العواصم والقواصم'' میں لکھتے ہیں: ''رہا جاہل تو وہ ابن قتیبہ ہے، جس نے صحابہ کی کوئی تصویر ''الامامۃ والسیاسۃ'' نامی کتاب میں نہیں چھوڑی، اگر اس کتاب کے مندرجات کی نسبت اس کی طرف صحیح ہے''۔ [(۱)] چنانچہ ابن العربی نے ابن قتیبہ پر سخت تنقید کرنے کے ساتھ اس کی طرف کتاب کی نسبت میں بھی شک کا اظہار کیا ہے، ابن العربی کی اس عبارت پر اس کتاب کے محقق محبّ الدین الخطیب نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس کتاب کے مشمولات کی نسبت ابن قتیبہ کی طرف صحیح نہیں ہے، اگر اس کتاب کی نسبت ابو محمد مسلم بن قتیبہ کی طرف صحیح ہو تو پھر وہ بقول ابن عربی نرے جاہل ہوں گے، حالانکہ وہ امام، حجہ، اور ثبت تھے، کیونکہ ''**الإمــامة والسيــاسة**'' نامی کتاب جہالت و نادانی، عبارت کی ناموزونی، کذب بیانی اور جعل سازی سے بھری ہوئی ہے، نیز ''**الإمــامة والسيــاسة**'' کا مصنف مصر کے دو عالموں سے بکثرت روایت کرتا ہے، حالانکہ ابن قتیبہ مصر گئے ہیں، نہ ان دونوں عالموں سے روایت کی ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ابن قتیبہ کے خلاف ایک سازش ہے۔'' [(۲)]

مستشرق مارگلیوتھ اس کتاب کے بارے میں کہتا ہے: ''... ابن قتیبہ کی طرف منسوب ایک دوسری کتاب، اس کی پہلی کتاب (یعنی ''المعارف'') سے بظاہر بالکل مختلف ہے، اور وہ ''**الامـامة والسيـاسة**'' نامی کتاب ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے لے کر ہارون رشید کی وفات تک کی اسلامی حکومت کی تاریخ پر مشتمل ہے، تاریخ کے سلسلے میں اس کتاب کی غلط بیانی، اور جعل سازی اس قدر واضح ہے کہ یہ ابن قتیبہ کی کتاب نہیں ہو سکتی'' [(۳)]

اس کتاب کے مصنف نے بنی امیہ کے ساتھ صریح ظلم، کھلم کھلا غلط بیانی اور فریب و جعل سازی بھی کی ہے، بالخصوص واقعۂ حرہ سے متعلق گفتگو کے وقت، جہاں وہ اس واقعہ کو انتہائی تفصیل سے اور خوفناک صورت میں اپنی کتاب کے پہلے حصہ کے اختتام پر بیان کرتا ہے، اور جس کے شواہد

(۱) ابن العربی: ص، ۲۴۸ (۲) محبّ الدین الخطیب، حاشیہ رقم ۱، ص ۲۴۸
(۳) مارگلیوتھ، ص، ۱۳۴-۱۳۵

کے طور پر ان چنیدہ بھیانک مظالم کو پیش کرتا ہے، جس کے ارتکاب کی تہمت، مدینہ کی تین روزہ بے حرمتی کے دوران بنوامیہ کی فوج پر لگائی جاتی ہے، جب کہ یہی مصنف انھیں واقعات کی ایک دوسری تصویر کتاب کے دوسرے حصہ میں اس طرح پیش کرتا ہے، جیسے وہ اس خوفناک واقعہ کو بالکل بھول چکا ہو جس کو پہلے بیان کر چکا ہے۔

لہذا اس کتاب پر بنوامیہ کی تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے بالکل اعتماد نہیں کیا جا سکتا، تاوقتیکہ اس کتاب کی پوری تحقیق اس کے حقیقی مصنف کی تلاش کے ذریعہ نہ کر لی جائے۔

ان کے علاوہ چند مآخذ اور بھی ہیں، جن کی اہمیت ان بنیادی مآخذ سے کمتر ہے، اور ان کی حیثیت ثانوی مآخذ کی ہے، جن میں سے ایک ماخذ بھی بنیادی مآخذ کی جگہ نہیں لے سکتا، لیکن اس کے باوصف بعض مؤرخین نے مدینہ کی بے حرمتی کو ثابت کرنے والے ماخذ کی حیثیت سے ان پر اعتماد کیا ہے، بلکہ بعض مؤرخین تو ان میں سے صرف کسی ایک کتاب پر مدینہ کے واقعہ کے بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت سے اعتماد کرتے ہوئے اس دور کے بنیادی مآخذ کو نظر انداز کر دیتے ہیں، ان ثانوی درجہ کے مصادر و مآخذ میں سے ایک کتاب ''**الفخری فی الآداب السلطانیة**''، بھی ہے، جس کے مصنف ابن الطقطقی ہیں، جنھوں نے اپنی اس کتاب کو شہر موصل میں سنہ ۷۰۱ھ میں مکمل کیا ہے۔

یہ مصنف ان واقعات کے بہت بعد کا ہونے کے علاوہ شیعہ بھی ہے، اور اس کے شیعہ ہونے کی علامات اس کی کتاب میں واضح طور پر پائی جاتی ہیں،(۱) چنانچہ وہ ان چند لوگوں میں شامل ہے جنھوں نے مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کو بیان کرنے میں ایسی مبالغہ آرائی کی ہے، جس کی کوئی تائید ہمیں بنیادی مآخذ میں نہیں ملتی۔(۲)

ثانوی درجے کے مآخذ میں سے دو مآخذ اور بھی ہیں، ایک اصفہانی (**وفات ۳۵۶**) کی کتاب ''الاغانی'' اور دوسری ابن عبدربہ (**وفات ۳۲۸**) کی ''العقد الفرید'' ہے۔

اور یہ امر مخفی نہیں ہے کہ مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کی طرح کسی اہم واقعہ کے بنیادی ماخذ کی حیثیت سے ان دونوں کتابوں پر کسی محقق کا اعتماد کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر کسی رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دینا مقصود ہو تو ان دونوں کتابوں کا حوالہ معاون مآخذ کی حیثیت سے دیا جا سکتا ہے، لیکن

---

(۱) احمد امین، ظہر الاسلام، ۲/۲۰۲ و ۴/۲۱۶

(۲) ابن الطقطقی، ص، ۱۱۶

اس میں بھی حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ ان دونوں کتابوں میں وہ اوصاف نہیں پائے جاتے جو بنیادی مآخذ میں پائے جاتے ہیں، اور نہ یہ دونوں کتابیں ان کے معیار کی ہیں۔

جب ہم واقعہ کی تہ تک پہنچنے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے طبری کے راویوں کی تحقیق اور چھان بین کے طریقۂ کار کو اپنانے، اور ان کی روایتوں کے موازنہ کا مطالبہ کرتے ہیں، تو پھر دوسرے مآخذ کی نسبت ہمیں اپنے موقف میں مزید احتیاط برتنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان مآخذ میں بیشتر ایسے ہیں جو ہمیں اپنے راویوں کے نام تک فراہم نہیں کرتے، بلکہ صرف کسی ایک روایت کے نقل کرنے پر اکتفا کر لیتے ہیں، حالانکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین نے ان واقعات کا زمانہ نہیں پایا ہے جن کو انھوں نے اپنی تاریخوں میں درج کیا ہے، اس لئے اس بات کا پورا احتمال ہے کہ ان مصنفین میں سے ہر مصنف نے ان روایتوں میں سے جو انھیں بہم پہنچی تھیں، کسی ایک روایت کو لے لیا ہو، اور بقیہ کو نظر انداز کر دیا ہو، اسی طرح ان واقعات کے بارے میں مصنف کے رجحانات کا دخل یا ان واقعات سے اس کی لاعلمی کے احتمال کی نفی بھی نہیں کی جا سکتی۔

مدینہ کی بے حرمتی (کا ذکر) نئی کتابوں میں:

میں نے نئی کتابوں میں سے ان مخصوص کتابوں کا انتخاب کیا ہے، جو یونیورسیٹیوں کے طلبہ اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے شائقین کے درمیان زیادہ رائج اور متداول ہیں، لیکن میرا ان کتابوں پر بحث کرنے کا مقصد ان کتابوں کو مجروح کرنا، یا ان کے مصنفین کی اہمیت کو گھٹانا نہیں ہے، بلکہ اس فرض کا احساس ہے کہ ہمیں اپنی اسلامی تاریخ کو ان تہمتوں اور بدنما داغوں سے پاک کرنے کی ضرورت ہے جو اس پر لگائے گئے ہیں، ان مصنفین نے جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت اجتہاد سے زیادہ نہیں ہے، اور اجتہاد میں خطا و صواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے، اگر پہلی شق یعنی غلطی واقع ہوتی ہے تو پھر اس غلطی میں ان کی نیت پر مجھے کوئی شک نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارا مقصد تو ایک علمی اور امانت دارانہ بحث کے ذریعہ بہر طور حقیقت کی تلاش کرنا ہے۔

اولاً: کتاب "تاریخ الإسلام السیاسي والدیني والثقافي والاجتماعي" از: ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن۔

مصنف اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

"پھر مسلم نے بیماری کی حالت میں مدینہ کا رخ کیا، اور حرہ کے کھلے ہوئے حصے کی جانب

سے اس کا محاصرہ کرلیا، اور اسے فتح کرنے کے بعد فوج کے لئے تین روز تک اس کی بے حرمتی کو حلال کر دیا' اور پھر وہ اور اس کی فوج قتل وغارت گری اور ظلم وستم میں حد سے آگے بڑھ گئے، چنانچہ اسی وجہ سے اسے مسرف یعنی حد سے تجاوز کرنے والا کہا جانے لگا، اس معرکہ میں جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے سراپا شر تھا، مدینہ کے چنیدہ اور بڑے بڑے شہ سوار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منتخب صحابۂ کرام شہید ہوئے، اور یوں بنو امیہ نے مدینہ کی حرمت وعزت کو آلودہ اور پامال کیا۔"(۱)

یہاں مصنف نے ان مآخذ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا جن پر انھوں نے مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کو ثابت کرنے کے لیے اعتماد کیا ہے، اور نہ ہی اس واقعہ کا کوئی تاریخی تجزیہ پیش کیا ہے، گویا کہ یہ واقعہ مصنف کی نظر میں ایک مسلمہ حقیقت ہے، اور ایک ایسے قطعی فیصلے پر اس کو ختم کیا ہے، جس سے قاری کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ ایک حقیقی واقعہ ہے جس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور جب کوئی نیا اور معاصر مؤرخ کسی واقعہ کے بارے میں اس طرح کا سنگین حکم صادر کرتا ہے تو اس سے یہ توقع رکھی جائے گی کہ اس نے یہ حکم اس واقعہ کے تمام مآخذ کے تفصیلی مطالعے اور اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد لگایا ہوگا، اور اسے مسلمہ تاریخی اسباب وشواہد کو بھی پیش کرنا چاہئے جو اس کے اس فیصلہ کو صادر کرنے کا سبب بنے ہیں۔

رہا وہ فیصلہ جو ان امور کی رعایت کے بغیر ہو تو یہ ایسا طریقہ کار ہے، جو حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کارآمد نہیں ہے، اور جب کہ یہ مؤرخ دوسرے مؤرخین کے درمیان نمایاں مقام رکھتا ہو، جیسا کہ خود اس مصنف کی شخصیت ہے، تو معاملہ کی سنگینی اور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ اس صورت میں اس مصنف کی آراء کے اقتباس کا اس کے بعد آنے والوں، یا اس سے کمتر لوگوں، یا اس کے شاگردوں کی طرف سے احتمال رہتا ہے، جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ بنیادی مآخذ میں پائے جانے والے معلومات اوپر ذکر کیے گئے، ان میں شک وشبہہ سے بالاتر کوئی ایسی قطعی دلیل نہیں پائی جاتی جو اس حکم کی تائید کرتی ہو۔

ثانیاً: "أيام العرب في الإسلام" از، ڈاکٹر محمد ابوالفضل ابراہیم وعلی محمد البجاوی۔

اس کتاب میں یہ جملہ مذکور ہے: "اہل مدینہ کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، اور مسلم نے تین روز

---

(۱) حسن ابراہیم: ۲۸۶/۱

تک اس کی بے حرمتی کی، اور فوج اس دوران لوگوں کا قتل اور غارت گری کرتی رہی"[۱]

یہاں بھی کتاب کے دونوں مصنفوں نے مدینہ کی بے حرمتی کے بارے میں اپنے ماٰخذ کا کوئی پتہ نہیں دیا، ان مصنفوں کے ماٰخذ حرہ کے پورے واقعہ میں حسب ذیل ہیں: "**العقد الفريد**"، "**الأغاني**" اور "**الفخري في الآداب السلطانية**"۔ معلوم نہیں کیسے ان دونوں مصنفوں نے یہ گوارا کیا کہ ان ثانوی درجے کے ماٰخذ پر اعتماد کریں، اور اس موضوع کے بنیادی ماٰخذ سے تغافل برتیں، جبکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کوئی تاریخی رائے جس کے ماٰخذ صرف ثانوی درجے کے ہوں، وہ رائے یکسر قابل التفات نہیں ہے۔

ثالثاً: "التاريخ الإسلامي العام" از: ڈاکٹر علی ابراہیم حسن۔

کہتے ہیں: "اور اس ہزیمت کے بعد مسلم بن عقبہ کی فوج نے تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی کی، اور اس نے اور اس کے لشکر نے خوب لوٹ مار، اور ظلم وزیادتی کی، چنانچہ اس کا لقب ہی مسرف پڑ گیا (اَ)"[۲]

(الف) کا حوالہ "مروج الذہب"، للمسعودی کی طرف ہے۔

اور مسعودی نے جیسا کہ گزر چکا ہے، مدینہ کی تین روز تک بے حرمتی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ اس نے صرف مسلم بن عقبہ کے قتل وغارت گری میں حد سے تجاوز کرنے کی جانب اشارہ کیا ہے، اس لئے اس ماخذ پر مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کو ثابت کرنے کے لئے اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے، اسی طرح صرف مسعودی پر اس موضوع کے متعلق اعتماد کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ مسعودی کو شیعہ اپنے شیوخ میں شمار کرتے ہیں۔[۳] اور پھر طبری سے مکمل چشم پوشی کیوں؟

رابعاً: کتاب: "التاريخ الإسلامي والحضارة الإسلامية" از، ڈاکٹر احمد شلبی،

لکھتے ہیں:

"... مسلم نے ان پر حرہ کی جانب سے حملہ کیا اور ان پر فتح حاصل کی اور مدینہ کی تین دن تک بے حرمتی کی۔ (الف)"[۴]

(۱) محمد ابوالفضل ابراہیم ص، ۴۲۸ — (۲) علی ابراہیم حسن: ۲۸۱
(۳) دیکھئے، اعیان الشیعہ — (۴) احمد شلبی، ۲/ ۴۶

حوالۂ (الف): الطبری اور الفخری فی الآداب السلطانیہ۔

یہاں طبری کے حوالہ کا مطلب مصنف کا ابومخنف کی روایت کو اختیار کرنا، اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اپنی رائے کی دلیل کے طور پر پیش کرنا ہے، اور طبری کی ذکر کردہ دوسری روایتوں سے چشم پوشی ہے، اور اس طرز عمل سے مصنف خود اس غلطی کا شکار ہو گئے ہیں جس سے انھوں نے یہ کہتے ہوئے متنبہ کیا ہے کہ: ''قابل تعجب امر یہ ہے کہ اکثر نئے اور معاصر مسلمان اور مستشرق مؤرخین نے قدیم مؤرخین کی تحریروں کو حقائق کے طور پر قبول کر لیا ہے، اسی وجہ سے بیشتر نئی تحقیقات انصاف سے بعید ہیں۔''

خامساً: کتاب ''الدولة العربية والإسلامية'' از، ڈاکٹر علی حسنی الخربوطلی

یہ اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

''... حرہ کا معرکہ بپا ہوا، اور اہل مدینہ کی شکست پر ختم ہوا، اموی لشکر نے بھیانک اور گھناؤنے مظالم ڈھائے، قتل وخونریزی کا بازار گرم کیا اور ایسی ایسی سنگین حرکتیں کیں جن کی مذمت پر تمام مؤرخین کا اتفاق ہے، چنانچہ مسلم نے اپنی فوج کو تین روز تک مدینہ کی بے حرمتی کی کھلی چھوٹ دے دی، اور وہ مدینہ کے باشندوں کا خون بہاتی، اور ان کے مال واسباب لوٹتی رہی (الف)، جس میں اسی (۸۰) صحابۂ کرام، سات سو قریش وانصار اور دس ہزار عام لوگ مارے گئے (ب)''۔(۱)

حوالہ: (الف)، الطبری، (ب)، الإمامہ والسیاسہ، لابن قتیبہ

ہمیں یہاں ایسی مبالغہ آرائی کی بو محسوس ہو رہی ہے جس میں حکم صادر کرنے سے پہلے حقیقت کی تلاش وجستجو نہیں کی گئی، چنانچہ مصنف کا یہ فیصلہ کہ اموی لشکر نے جرائم کا ارتکاب کیا، کسی خالص غیر جانب دار اور مکمل مطالعہ وتحقیق کا نتیجہ نہیں ہے، مزید برآں انھوں نے مقتولین کی تعیین کے سلسلہ میں ایک ایسی کتاب پر اعتماد کر لیا جس کی ابن قتیبہ کی طرف نسبت صحیح نہیں ہے، اس لئے انھیں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اپنے صادر کردہ حکم کی تائید کے لئے صرف طبری کا حوالہ دے دینا کافی ہے، جب کہ طبری کی یہ روایت مکمل طور پر قابل اعتماد بھی نہیں ہے، یہ تو طبری پر ظلم ہے کہ ان پر اس روایت کی ذمہ داری ڈال دی جائے اور ان کی دوسری روایتوں کو نظر انداز کر دیا جائے، اور رہا الإمامة

(۱) الخربوطلی ص،۲۰۴-۲۰۵

والسيـــــاسة نامی کتاب پراعتماد کرنا تو یہ بھی نا قابل قبول ہے، اوراس کی وجہ اس کتاب کی بابت مؤرخین کا وہ موقف ہے جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے۔''(۱)

سادساً: کتاب ''تاريخ الدولة العربية'' از، ڈاکٹر السید عبدالعزیز سالم

وہ اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں: ''اور شام کی فوجوں نے ستائیس ذی الحجہ سے پہلی محرم ۶۴ھ تک مسلسل تین دن اور تین رات مدینہ کی حرمت کو پامال کرنے کے بعد اپنی حرکتوں سے باز آئے (الف)''(۲)

حوالہ: الف، الامامہ والسیاسہ اور ابن اثیر۔

مصنف کا مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کو ثابت کرنے کے لئے ''الإمامة والسياسة'' نامی کتاب پر ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے اعتماد کرنا مذکورہ بالا اسباب کے پیش نظر قابل قبول اور لائق التفات نہیں ہے۔

اور موصوف نے ایک دوسرے ماخذ کی حیثیت سے ابن الاثیر سے جو استدلال کیا ہے تو اس طرز عمل سے انھوں نے تاریخی بحث وتحقیق کے صحیح طریقے کو سخت نقصان پہنچایا ہے، حیرت ہے کہ انھوں نے اصل کو یعنی طبری کو چھوڑ کر اس کی فرع پر کیونکر اکتفا کر لیا ہے، حالانکہ انھوں نے کوئی ایسی دلیل بھی پیش نہیں کی جو ہمیں ان کی اس رائے پر مطمئن کر دے۔

سابعاً: کتاب ''دور الحجاز في الحياة السياسية العامة في القرنين الأول والثاني للهجرة'' از، ڈاکٹر أحمد إبراہیم الشریف۔

لکھتے ہیں: ''مسلم مدینہ میں داخل ہوا، اور اس نے مدینہ کی بے حرمتی کو اپنی فوج کے لئے تین روز تک جائز کر دیا، پھر لوگوں کو اس بات پر بیعت کی دعوت دی کہ وہ یزید بن معاویہ کے غلام ہیں، وہ اپنی مرضی سے ان کی جان ومال کا فیصلہ کرے گا، اور اس نے اس دوران ظلم وجبر اور احمقانہ حرکتوں کی حدیں پار کر دیں۔''(۳)

قابل افسوس امر یہ ہے کہ اس کتاب نے اپنی ان معلومات کے مآخذ کا ذکر تک نہیں کیا، اور

---

(۱) دیکھئے ص ۱۰-۱۱ (۲) عبدالعزیز سالم ص ۴۰۷

(۳) احمد ابراہیم الشریف ص ۴۳۲

یہ بات ایک ایسے مؤرخ کی طرف سے بڑی عجیب لگتی ہے جو پہلی اور دوسری صدی ہجری کے زمانے میں حجاز کے کردار پر خصوصی کتاب لکھتا ہے، اور اس میں مدینہ کی بے حرمتی جیسے سنگین واقعہ کو ایسے اسلوب میں زیر بحث لاتا ہے جس میں احتیاط اور باریک بینی کا فقدان ہے، جبکہ مؤلف نے خود کتاب کے مقدمے میں [1] اصلی عبارتوں کے احاطہ کرنے اور ان میں غور وخوض کے سلسلہ میں تجزیاتی طریقۂ کار کے استعمال کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ثامناً: کتاب ''التاريخ السياسي للدولة العربية'' از، ڈاکٹر عبدالمنعم ماجد۔

موصوف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ''... اور اس وقت مسلم مدینہ کی بے حرمتی سے جو اس نے اپنی فوج کے لئے تین روز تک روا رکھی تھی، باز نہیں رہا (الف) اور اس نے بے تحاشا قتل کیا، چنانچہ اس کی اس بری حرکت کی وجہ سے اس کا نام ہی مسرف یعنی حد سے تجاوز کر جانے والا پڑ گیا (ب) چنانچہ اس کی فوج نے انصار کے بہت سے جوانوں کا خون بہایا، ان کا مال لوٹا، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا اور آبروریزی کی۔ اسی طرح مسلم نے اہل مدینہ کو یزید کے غلام ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے بیعت پر مجبور کیا اور جو اس بیعت سے پس وپیش کرتا، اس کی گردن اڑا دیتا، بایں طور اس نے یزید سے کئے ہوئے اپنے اس وعدے کو پورا کر دیا کہ وہ مدینۂ رسول کو زیروزبر کر دے گا (ج) [2]

حوالۂ (الف): یعقوبی اور، (ب) الأغانی (ج) الأغانی

ڈاکٹر عبدالمنعم ماجد نے مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کے اثبات کے لئے یعقوبی پر اعتماد کیا ہے، جبکہ اس سے پہلے انھوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں یعقوبی پر شیعہ ہونے کا الزام لگایا ہے [3] اس کے باوجود انھیں صرف اسی کی روایت کو قبول کرنے میں کوئی تردد نہیں ہوا، بجائے اس کے کہ وہ اس موضوع کی ان دوسری روایتوں پر بھی نگاہ ڈال لیتے جو بنیادی مآخذ میں موجود ہیں، اسی طرح انھوں نے کتاب کے مقدمہ میں اس بات پر بھی زور دیا ہے [4] کہ نئے مؤرخ کے لئے ضروری ہے کہ اموی حکومت کی تاریخ کو زیر بحث لاتے وقت پوری احتیاط سے کام لے، کیونکہ اموی حکومت سے متعلق بیشتر کتابیں عہد عباسی سے ہو کر ہم تک پہنچی ہیں، جس کو عربوں سے -بقول مصنف- دشمنی

(۱) احمد ابراہیم الشریف، المقدمہ، ص، ھ (۲) عبدالمنعم ماجد: ۸۷/۲
(۳) ایضاً: ۲۷/۱ (۴) ایضاً: ۲۲/۱

تھی، تو دیکھئے وہ خود اس طریقۂ کار کی مخالفت کرتے ہیں، اور اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔

مصنف نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے اموی لشکر پر عورتوں اور بچوں کو قیدی بنانے اور ان کی آبرو ریزی کرنے کی بھی تہمت لگا دی ہے، لیکن کسی بھی ماخذ سے اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی، شاید وہ اسے ایک ایسا واقعہ سمجھتے ہیں جس کا صحیح ہونا ثابت شدہ حقیقت ہے، جبکہ ہمیں اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی تائید بنیادی ماٰخذ میں نہیں ملتی، یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے جس کے بھول جانے، یا نظر انداز کر دینے کا تاریخ کے راویوں کی طرف سے احتمال ہو، بالخصوص ان لوگوں کی طرف سے جن کے دلوں میں بنوامیہ کی محبت بھی نہیں پائی جاتی تھی۔

رہا مصنف کا ''الأغانی'' میں موجود اس فقرہ کا نقل کرنا کہ: اموی لشکر نے جو کچھ کیا وہ مسلم کے اس وعدہ کا نفاذ تھا جو اس نے یزید سے کیا تھا کہ وہ مدینہ کو زیروزبر کر کے چھوڑے گا، تو یہ ایسی بات ہے جس میں صاحب اغانی منفرد اور تنہا ہے، چنانچہ اس دور کی تاریخ کے بنیادی ماٰخذ میں اس روایت کی کوئی اصل مطلقاً نہیں پائی جاتی، اور ''اغانی'' نامی کتاب جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اسلامی تاریخ کے سنگین واقعات کی تحقیق کے میدان میں تنہا کھڑی نہیں ہوسکتی۔

اور یوں ہمیں معاصر مؤرخین میں سے کوئی مؤرخ ایسا نہیں ملتا جس نے مدینہ کی بے حرمتی کے واقعہ کی خالص علمی تحقیق اور چھان بین کی ہو، اور اس موضوع کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا ہو، اگرچہ وہ سب کے سب اس واقعہ کے واقعتاً وقوع پذیر ہونے کے اثبات پر متفق نظر آتے ہیں، مگر وہ تسلی بخش تاریخی شواہد اور وجہ جواز پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں، ان میں سے بعض نے تو صرف اس پر اکتفا کیا کہ اپنی آراء کی ذمہ داری کبھی تو بعض بنیادی ماٰخذ کے مصنفین کے سر ڈال دی، اور کبھی شواہد کے طور پر ان کتابوں کا سہارا لیا جو ثانوی درجہ کی ہیں، ان میں بہت کم تعداد ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس واقعہ کے ماخذ کی حیثیت سے طبری کا حوالہ دیا ہے، لیکن انھوں نے بھی طبری کی دوسری روایتوں سے تغافل برتتے ہوئے صرف ابومخنف کی روایت پر اعتماد کیا ہے، اس لئے اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے میں تاہنوز شک قائم ہے۔

(جاری ہے)

اسلامی کتب خانے

(پانچویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی   ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

عربی زبان میں تصنیف کی ابتدا:

پہلی صدی ہجری کے نصف سے پہلے ہی عربی تصانیف عالم وجود میں آنے لگی تھیں، یہاں تک کہ جب دوسری صدی ہجری آئی تو عربی تصانیف کی تحریک نے بہت ترقی اختیار کرلی، خاص طور سے جب مسلمانوں نے چین سے کاغذ سازی کی صنعت کی تحصیل کی اور اسلامی شہروں میں وسیع پیمانے پر اس کا استعمال ہونے لگا، چنانچہ دوسری صدی ہجری کے اواخر سے عالم اسلام میں ترجمہ وتالیف کا بازار گرم ہوگیا، علم ومطالعہ اور ہر میدان میں تصنیف وتالیف میں لوگ ہمہ تن متوجہ اور منہمک ہوگئے، اور کتابوں کی محبت اور ان کی فراہمی کا رجحان عام ہوا۔

اسلام کے پھیلنے کے بعد اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، اور مسلمان ان ثقافتوں سے روشناس ہوئے جو مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں، یہ ثقافتیں یونانی، سریانی، فارسی اور قبطی تھیں، مسلمان اپنی تہذیب وثقافت میں ان سے متاثر ہوئے، اور ان اثرات کو اپنی کتابوں میں منتقل کیا۔

یہاں یہ اشارہ کردینا مناسب ہوگا کہ مسلمان مذکورہ بالا ثقافتوں اور تہذیبوں سے متاثر ہونے اور اکتساب کرنے کے باوجود ان کے مقلد بن کر نہیں رہے، بلکہ انھوں نے ایجاد واختراع کا راستہ اختیار کیا، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ترجمے کیے، اور ان تہذیبوں سے اکتساب کیا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے جو نقل کیا اس کو اسلام کے ایسے سانچے میں ڈھال دیا، جو مذہب اسلام اور اسلامی کلچر کی فطرت اور اخلاق ونظریات سے ہم آہنگ تھا۔

اس واسطے کہ اسلام علم ومعرفت کا مذہب ہے، اور اس مذہب کے اہم نظریات میں سے علم،

کتاب اور لکھی ہوئی بات کا احترام ہے، اسلام سابقہ تہذیبوں کو منہدم نہیں کرتا، بلکہ ان کا مطالعہ کر کے ان کو صاف ستھرا بناتا ہے، اور پوری انسانیت کی خدمت کے لیے ان پر اضافہ کرتا ہے۔

اسی سلسلے میں جمال الدین افغانی کہتے ہیں کہ: ''یہ علوم جن کو ان مسلمانوں نے فتح کے حق کے طور پر حاصل کیا، اور انھوں نے ان کو ترقی بخشی، ان کے پیمانوں کو وسعت عطا کی، اور ان کو منطقی ترتیب دی، اور ان میں وہ لوگ درجۂ کمال کو پہنچ گئے، جو ذوق کی سلامتی کا ثبوت پیش کرتی ہے، اور بے نظیر مستقل مزاجی اور باریک بینی کی عکاسی کرتی ہے''۔

اور جرمنی کی خاتون مستشرق زیفرید ہونکہ بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ: ''جن علوم کو انھوں نے -مسلمانوں- نے تباہ و برباد ہونے سے بچالیا، تو انھوں نے نسیان و تعفن کی دنیا سے نکال لیا، ان میں زندگی کی نئی روح پھونک دی، اور نقل و ترجمہ کے ذریعے ان کو ہر خواہش مند کی دسترس میں کر دیا، اور انھوں نے ان کا ترجمہ بھی کسی جامد اور خشک زبان میں نہیں کیا، بلکہ ایک ایسی زبان میں کیا جو اس وقت ہر جگہ زندہ تھی، جو قرآن کی زبان ہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں تصانیف و تحقیقات کی اس قدر فراوانی ہوئی، کہ علوم و فنون شاخ در شاخ ہوتے گئے، حتی کہ پانچ سو سے زیادہ علم و فن وجود میں آ گئے، اور مسلمانوں کی تصانیف اس قدر بڑھ گئیں کہ ہزاروں ہزار کی تعداد میں پہنچ گئیں، مثال کے طور پر انھوں نے صرف تاریخ میں اتنی بڑی تعداد میں کتابیں تصنیف کیں جو شمار سے باہر ہیں، اور کوئی قوم حتی کہ دور جدید کی بھی کوئی قوم علم کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکی جہاں تک مسلمان پہنچ چکے تھے، صرف ''کشف الظنون'' میں جن کتابوں کا نام آیا ہے وہ شرحوں اور مختصرات کو چھوڑ کر بارہ ہزار ۱۲۰۰۰ سے زیادہ ہے، یہ تعداد ان کتابوں کے علاوہ ہے، جو ضائع ہو گئیں اور جن کا ذکر رہ گیا ہے، جو بہت بڑی تعداد میں ہیں۔

جہاں تک کتابوں کے جمع کرنے اور درس و مطالعہ کے لیے خاص مقامات پر ان کو بہم پہنچانے کا تعلق ہے، تو محمد کرد علی کا بیان ہے کہ اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز -رحمۃ اللہ علیہ- نے سب سے پہلے یہ قدم اٹھایا، جب کہ انھوں نے مدینہ کے گورنر ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم کو یہ خط لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث یا سنت ہے، اس کو تلاش و جستجو کر کے لکھ لیں، اس لیے کہ ان کو علم کے مٹ جانے اور علماء کے -دنیا سے- چلے جانے کا ڈر ہے۔

کردعلی نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ عبدالحکم جُمحی نے مکہ میں ایک ادبی انجمن قائم کی تھی، اوراس سے ملحق ایک کتب خانہ بنایا تھا، جس میں ہر علم سے متعلق کتابیں فراہم کی تھیں، یہ کارنامہ پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں روبہ عمل آیا تھا، جمحی کی عمارت کے طرز پر ابن سعد نے طبقات میں ایک دوسری عمارت کا بھی تذکرہ کیا ہے، جو ''بیت ابویعلی'' کے نام سے موسوم تھی؛ اسی زمانے میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلی مقتول ۸۵ھ کے ایک مکان کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس میں قرآن کریم کے نسخے تھے، جس میں قرآن کریم پڑھنے والے جمع ہوتے، جو سوائے کھانے کے کسی اور کام کے لیے کم ہی وہاں سے ہٹتے۔

دوسری صدی ہجری کے آخر میں یعنی نویں صدی عیسوی کے شروع میں عبداللہ بن ہانی اندلسی نے استفادہ کے لیے آنے والوں کے واسطے ایک مکان تعمیر کررکھا تھا، جس میں واردین وصادرین کو ٹھہرایا کرتا تھا، اور اپنی آمدنی کو اس کے مصارف اور کاغذ وغیرہ میں صرف کردیا کرتا تھا، اور آنے والوں کے لیے کتابوں کی نقل میں سہولت پیدا کرتا تھا، اس کے پاس اتنی بڑی تعداد میں کتابیں تھیں کہ بعد میں چار لاکھ درہم میں فروخت ہوئیں، یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ اس سے کتابوں کی کثرت تعداد کا اندازہ ہوتا ہے، اس لیے کہ اس وقت عام طور پر ایک کتاب کی قیمت دس درہم ہوا کرتی تھی، البتہ اگر کوئی نفیس نسخہ ہوتا تو اس کی قیمت سو درہم تک بھی پہنچ جایا کرتی تھی۔

اسی طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک -رحمہ اللہ تعالیٰ- مطالعہ کا شوقین اور کتابوں کا دلدادہ تھا، اس کی ملکیت میں ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس کا ایک آدمی کو نگراں مقرر کررکھا تھا، جو لوگوں میں ''صاحب المصاحف'' کے نام سے معروف تھا، یہ وہ لقب ہے جس کے ہم معنی اب ''ناظم کتب خانہ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے[1]۔

ولید بن عبدالملک ہی کی روش پر اس کا ہم نام اور بھتیجا ولید بن یزید بن عبدالملک -رحمہ اللہ تعالی- بھی تھا، جو قریش کے جواں مردوں، ادیبوں، زیرکوں، اور زبان آوروں میں تھا، وہ کتابوں کے شوق اور بہر طور ان کی فراہمی کے لیے مشہور تھا، یہاں تک کہ دارالخلافت میں -جہاں وہ ایک سال اور سال کے کچھ حصوں سے زیادہ نہیں رہا- اتنا بڑا ذخیرہ جمع کررکھا تھا کہ ابن سعد کو اس کے متعلق لکھنا پڑا

---

(۱) کردعلی/ الإسلام والحضارة العربية، ج ۱: ص ۱۷۶

کہ: ''ولید بن یزید کے خزانوں سے کتابیں اور دفاتر جانوروں پر لاد کر لے جائی گئی تھیں''۔

عہد عباسی اور فروغ علم:

اسلامی قلمرو میں کتب خانوں کے قیام کا رجحان بڑھتا پھیلتا اور فروغ پاتا رہا، حتی کہ عہد عباسی میں، خاص طور سے مامون کے زمانے میں-جس کو مورخین تصنیف وتالیف، بحث وتحقیق، اور نقل وترجمہ کے عہد زریں سے تعبیر کرتے ہیں-اپنے اوج کمال کو پہنچ گیا۔ اس عہد میں اسلامی تہذیب پھلی پھولی، ترجمہ وتالیف کی گرم بازاری ہوئی۔ مدارس، تعلیمی ادارے، اور مختلف قسم کے جامعات اور کتب خانے تعمیر کیے گئے۔ رصدگاہیں قائم کی گئیں۔ ملک علماء، فقہاء، اور طلب گاران علم ومعرفت سے معمور ہو گیا۔ خلفاء اور حکام نے علم ومعرفت کے اکتساب، کتابوں کی فراہمی، کتب خانوں کے اہتمام اور ان کی حوصلہ افزائی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ اور کاغذ کے استعمال، فتح سمرقند کے بعد اس کی صنعت کے فروغ اور وراقوں ونسخہ نویسوں کے طبقہ کے ظہور نے-جس نے اس دور میں بھی اور اس کے بعد بھی اسلامی تہذیب وثقافت کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا ہے- اور جس نے کتابوں کی کتابت اور ان کو فروختنی بنانے میں فنکاری کا مظاہرہ کیا-اس تحریک میں مہمیز لگانے کا کام کیا۔

وراقوں کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاروں، جلد سازوں اور ان ملازموں کا ظہور ہوا جو اسلامی کتب خانوں میں کام کیا کرتے تھے۔ اس عہد زریں میں بیشتر اس قسم کے کتب خانے عالم وجود میں آئے جو عصر حاضر میں پائے جاتے ہیں۔ اسی دور میں وہ کتب خانے وجود پذیر ہوئے جو مسجدوں اور جامع مسجدوں سے ملحق ہوتے ہیں۔ اسی دور میں شاہی کتب خانے، پرائیوٹ کتب خانے، عوامی کتب خانے (پبلک لائبریریاں)، اوقاف اور خانقاہوں کے کتب خانے، اسپتالوں کے کتب خانے، تحقیق ومطالعہ کے لیے مخصوص کتب خانے اور ان کے علاوہ بہت سی قسموں کے کتب خانے وجود میں آئے، جن سے اسلامی ادوار کا یہ روشن اور درخشاں دور معمور رہا۔

کتب خانوں کے نام، اور ان میں کام کرنے والے ملازمین:

مسلمان کتب خانوں کو متعدد ناموں سے یاد کیا کرتے تھے، منجملہ ان کے یہ اسماء ہیں: دار الکتب، خزانۃ الکتب، بیت الحکمت، خزانۃ الحکمت، دار الحکمت، دار العلم، اور بیت الکتب۔

اور جو کتب خانے کا ذمہ دار-لائبریرین- ہوتا تھا، اس کو ''صاحب الخزانۃ'' یا ''خازن

المکتبۃ'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور جن کو تصنیف وتالیف یا نقل وترجمہ میں دسترس حاصل ہوتی تھی، ان میں ممتاز اہل علم وادب سے اس کو منتخب کیا جاتا تھا، جو تصنیف وتالیف یا نقل وترجمہ میں خاصی دستگاہ رکھتا تھا، چنانچہ ان مشہور لوگوں میں سہل بن ہارون خزانۃ الحکمت کا وہ نگراں تھا، جو شاعر، ترجمہ نگار اور وسیع المطالعہ رائٹر تھا۔

لائبریرین کے مددگار بہت سے ایسے نسخہ نویس اور ورّاق ہوا کرتے تھے جو اپنے خط کی عمدگی میں مشہور ہوتے تھے۔ یہ نسخہ نویس کچھ مخصوص قواعد کے پابند ہوتے تھے، جن قواعد وضوابط کا تعلق کاغذ، روشنائی، روشنائی کے رنگ، اور ہر صفحے میں سطروں کی تعداد سے ہوتا تھا۔ نسخہ نویسوں کے دوش بدوش ان کتب خانوں میں مترجم اور جلد ساز بھی ہوا کرتے تھے، جو جلد سازی، زرکشی، نمبر کاری اور حفاظت کا کام انجام دیا کرتے تھے۔

ان میں کچھ مُناول - کتابیں دینے والے - ہوتے تھے، ان کا کام الماریوں پر رکھی ہوئی کتابوں تک طالب علموں کی رہنمائی کرنا یا ان کو کتاب لاکر دینا ہوتا تھا، اس طرح ان کا کام وہی ہوتا تھا جو عصر حاضر کے کتب خانوں میں کتاب جاری کرنے والے - Issue کرنے والے - ملازمین کا ہوتا ہے۔

کتابیں ان کتب خانوں کے اندر اور باہر دونوں طرح فراہم کی جاتی تھیں، باہر لے جانے کے لیے جو کتابیں بطور عاریت کے دی جاتی تھیں، اس کے لیے زرضمانت یا ایک متعین سیکورٹی لی جاتی تھی۔

کتب خانوں کے ساتھ فرط اہتمام کی وجہ سے مسلمانوں نے ان کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ صرف کی، چنانچہ - عموماً - کتب خانے متعدد کشادہ کمروں پر مشتمل ہوتے، جن سے ملحق کشادہ گیلریاں اور چوڑی کیبنیں ہوتیں، ان میں سے کچھ کیبن مطالعہ کے لیے مخصوص ہوتیں اور کچھ نسخوں کے نقل کے لیے، اور بعض علمی حلقوں اور مذاکروں کے لیے خاص ہوتیں، ان کتب خانوں کی زمین پر شاندار قالین اور فرش بچھے ہوتے، اور گرد وغبار وغیرہ کے اندر جانے سے بچانے کے لیے کھڑکیوں اور درازوں پر دبیز پردے پڑے ہوتے تھے(۱)۔

جو بڑے کتب خانے ہوتے تھے ان میں موضوع کے لحاظ سے کتابیں مختلف کمروں میں تقسیم

---

(۱) احسن التقاسیم: ۴۴۹، خطط مقریزی: ۲، ۴۵۹

ہوتی تھیں، ایک کمرہ عربی زبان کے لیے ہوتا، کوئی علوم عربیت کے لیے ہوتا، کوئی فقہی کتابوں کے لیے مخصوص ہوتا وغیرہ............ یہ کتابیں دیواروں میں بنی ہوئی الماریوں میں ترتیب وار رکھی ہوتی تھیں، اوراس ترتیب سے رکھی ہوتی تھیں جس سے استفادہ کرنے والوں کے لیے آسانی ہو سکے۔

نفیس کتابیں چمڑے کے چھوٹے چھوٹے صندوقوں میں محفوظ کی جاتی تھیں، اور صندوق کے اوپری حصے پر یا بغل میں کتاب اوراس کے مصنف کا نام لکھ دیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے اسلامی کتب خانوں میں منظّم اور باضابطہ فہرست سازی کا بھی رواج تھا، فہرستوں کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کے ذمہ داراس کے باہری حصوں میں سے کسی ایک میں اس میں دستیاب کتابوں کی فہرست چسپاں کر دیا کرتے تھے۔اس طرح اسلامی کتب خانے زمانۂ دراز سے تصنیف [1] کے ضوابط سے آشنا تھے، چنانچہ ابن سینا نے لکھا ہے کہ اس نے بخاریٰ کا کتب خانہ تصنیف شدہ پایا ہے۔ اور صلاح الدین نے فاطمیوں کا کتب خانہ تصنیف شدہ پایا، اور نظامیہ ومستنصریہ کے کتب خانے بھی مصنَّف تھے۔

مقریزی نے اپنی ''خطط'' میں ایک بہت دلچسپ بات تحریر کی ہے کہ دارالحکمت جس کو حاکم بامراللہ نے قاہرہ میں ۳۹۵ھ میں قائم کیا تھا، اس کے بجٹ کا ایک حصہ ان کتابوں کی مرمت کے لیے خاص تھا، جو پھٹ جاتیں اور جن کا ورق نکل جاتا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتابیں کثرت استعمال کی وجہ سے یا آفت رسی کی وجہ سے خراب بھی ہو جایا کرتی تھیں، اوران سب سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں کتابوں کی حفاظت ومرمت کی اہمیت کے تعلق سے کس قدر بیدار تھے، اور یہ بذات خود ہزار سال پہلے ان کے مکتبی شعور کی پختگی کی دلیل ہے۔ کتابوں اور کتب خانوں کے ساتھ مسلمانوں کی دلچسپی کی یہیں انتہا نہیں ہوگئی، بلکہ اس سے بہت آگے وہاں تک پہنچ گئی، جہاں تک آج کی ترقی یافتہ قومیں بھی کم ہی پہنچ سکیں۔

اس دور میں اسلامی کتب خانے مسلمانوں کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھے، چنانچہ یہ کتب خانے کسی متعین جماعت اور کسی خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھے، بلکہ ایسے مراکز تھے جو زندگی اور حرکت ونشاط کی شعاعیں بکھیرتے تھے، جس کا ہر طالب علم قصد کرتا تھا، اور یہ ایسی چیز ہے جو اس کے کثرت انتشار اور تعداد انواع سے ظاہر ہے۔

---

(۱) کتب خانوں کی کتابوں کو ان کی اقسام اور فن کے اعتبار سے ترتیب دینے کو ''تصنیف'' کہا جاتا ہے (مترجم)

اس دور-Period- میں مختلف قسم کے ایسے بہت سے کتب خانے وجود میں آئے، جو دوسری صدی سے لے کر ساتویں صدی ہجری کے آغاز تک روشن وتابندہ رہے۔

خاتمہ:

مذکورہ بالامعروضات سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ کتابوں اور کتب خانوں کی تاریخ میں مسلمانوں کا قائدانہ کردار رہا ہے، اور جب محمد-صلی اللہ علیہ وسلم- کی امت مسلسل کئی صدیوں تک تہذیب وتمدن کی مشعل بردار رہی، تو اس نے علم ومعرفت کے تمام میدانوں میں انسانیت کو زبردست پیداوار فراہم کی، اسلامی کتب خانے اس تہذیبی دھارے کے دوش بدوش تھے، اور اپنے اندر ان تمام ذخیروں کو جذب کرلیا تھا، جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرق ومغرب کی فتوحات میں عطا فرمایا تھا۔

اس طرح اسلامی کتب خانے اس سوسائٹی میں پھلے پھولے، جس کی ترقی کے نتیجے میں اور اسی کی ضرورت کے تحت وجود پذیر ہوئے تھے، اور درحقیقت اسلامی کتب خانے ایسے آئینے تھے، جن کے اندر اسلامی کلچر اپنی تمام تر عظمت وبلندی کے ساتھ عکس انداز ہوتا تھا، اور ایک ایسا ظرف تھا جس نے مسلمانوں کے سرمائے کو بشمول اس ورثے کے جس کو انھوں نے عالم قدیم سے اپنی زبانوں میں منتقل کیا تھا، سمولیا تھا۔

اور جس دن سے عالم اسلام باہر سے تاتاریوں اور صلیبیوں کے حملوں کا نشانہ بنا، اور اندر سے داخلی فتنوں نے اس کے قلب کو ہلا کر رکھ دیا، اس دن سے اس کی بنیادیں متزلزل ہونا شروع ہوگئیں، اور اس کے کتب خانے سرنگوں ہونے لگے، ان میں سے کچھ آگ کا لقمہ بن گئے، کچھ حملہ آوروں کی دست اندازی کا شکار ہوگئے، اور جو باقی بچے وہ سمٹ کر اور بجھ کر رہ گئے، اور اشاعت علم کے زندہ مراکز اس عظیم سرمائے کی باقیات کے اسٹور روموں میں منتقل ہوگئے، اس طرح اسلامی کتب خانے کسی ایک حالت پر نہیں رہے، بلکہ وہ زندگی کے انداز ورفتار کے اعتبار سے مؤثر اور متاثر ہوتے رہے۔

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ)

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گذشتہ سال جناب نے از راہ خدمت علوم دینیہ اپنے حلقہ کے چند مخلص مسلمانوں کو حلقۂ بہی خواہان دارالعلوم میں شامل کرا کے ایک اہم دینی خدمت انجام دی تھی، جناب کے ان سابقہ تعلقات کی بناء پر جو دارالعلوم سے وابستہ ہیں، ہمیں جناب کی ذات گرامی سے امسال بھی یہی امید ہے کہ ہر امکانی سعی سے دریغ نہ فرمائیں گے، چنانچہ امسال مولانا جماعت اللہ صاحب بستوی کو آپ کی خدمت میں روانہ کیا جارہا ہے۔ مولانا صاحب موصوف مختلف مقامات کا دورہ کر کے عنقریب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا فقط والسلام (۱)

شبیر احمد عثمانی	ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ	محمد طیب
(صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند)	(شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند)	(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

....

۸- ۳- ۶۲ھ

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ یہ تو جناب کو بخوبی معلوم ہے کہ اس مادر علمی کے اکثر وبیشتر طلبہ کی جملہ ضروریات محض مخلص مسلمانوں کی امدادوں سے پوری ہوتی ہیں۔ برما، مدراس، رنگون جیسے تجارتی شہروں کے دیندار مسلمان دارالعلوم کی نمایاں طور پر امداد فرماتے تھے، لیکن جنگ کے اثرات نے ان مقامات کی امداد کا سلسلہ منقطع کر دیا، اور مصارف دارالعلوم میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، بنا بریں امسال بھی مولانا جماعت اللہ صاحب آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ حسب

(۱) اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے، لیکن جس لفافے میں یہ مکتوب ملفوف ہے، اس پر ڈاک خانے کی مہر ۱۳/ مارچ ۴۲ء ثبت ہے (مرتب)

سابق موصوف کے ساتھ عملی تعاون فرما کر خدام دارالعلوم کو شکریہ کا موقع دیں گے، خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہوں، والسلام۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ　　　محمد طیب
(صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند)　　　(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

....

حضرت المحترم زید مجدکم السامی!

بعد سلام مسنون عرض ہے۔ بحمداللہ مع الخیر رہ کر مستدعی خیریت مزاج گرامی ہوں، جلسۂ احناف کانفرنس مئو آئمہ کے خطبۂ صدارت کی تردید بنام تبصرہ اہل حدیث کی طرف سے شائع ہوئی ہے، جس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی بھیجا گیا ہے اور غالباً جناب کے پاس بھی پہنچا ہوگا، اس میں بعض حملے تو میری ذات پر ہیں کہ مثلاً اردو کی کتابوں سے ترجمہ کر کے یہ خطبہ لکھا ہے، یہ نہ قابل جواب بات ہے نہ مجھ پر اس کا کوئی خاص اثر ہے، میں حقیقتاً قلیل العلم ہوں اور کوئی اہل علم اس قسم کے جملے میرے لیے لکھے تو وہ لکھ سکتا ہے۔ گو یہ واقعہ بھی غلط ہے کہ میں نے اردو کے رسالوں سے یہ مضمون لکھا ہے، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس بارہ میں کتنے رسالے اردو میں لکھے گئے ہیں، الا یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ الاقتصاد کہ وہ میں نے پورا پڑھا، حدیثوں کا ذخیرہ کچھ ذہن میں تھا کچھ اس سے مع ترجمہ لیا۔ ترجمہ میں عام طور پر میں آیات کا بیان القرآن سے لینے کا عادی ہوں، ایسے ہی حدیثوں کے تراجم بعض بعض حضرات سے لیے، کہیں حوالہ بھی دیا ہے جس کا مصنف تبصرہ کو بھی اعتراف ہے۔ بہر حال یہ کوئی اعتراض کی چیز نہ تھی کہ میں اپنے بزرگوں کے کلام سے مدد لوں اور اُس کا اجمالی حوالہ دیدوں۔

البتہ جو چیزیں نفس مسئلہ کے متعلق تبصرہ میں ہیں وہ قابل جواب ہیں، یا بزرگوں کی شان میں جہاں گستاخانہ لہجہ ہے وہ قابل تنبیہ ہے، گو تنبیہ بے فائدہ بھی ہے، تاہم ایک ادائے فریضہ کے طور پر اگر تنبیہ کی جائے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ مگر ضروری نہیں، لیکن نفس مسئلہ کے بارہ میں غلط فہمی کا دور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کام کو کون کرے؟ مجھے دارالعلوم کے مشاغل سے فرصت ہی نہیں ہے اور

معلومات بھی وسیع نہیں ہیں، کیونکہ مشغلہ زیادہ تر انتظامی ہے۔اس سلسلہ میں نظر جناب پر پڑی، اللہ تعالی نے آپ کو علم دیا ہے اور اس سلسلہ کی معلومات بحمداللہ جناب کی وسیع ہیں، اور اس باب میں حمایت مذہب اور نصرۃ دین کا کام آپ سے ظہور پذیر ہوتا رہا ہے، اگر آپ کے خیال میں بھی مناسب ہو، تو محض مسئلہ کے سلسلہ میں کچھ قلم بند فرمادیں۔ یہاں اس کی اشاعت کا بند بست کیا جائے گا، اور زیادہ نہیں مختصر جامع چیز جو اعتراض کا جواب ہو، اور بس۔اور یہ مقصود ظاہر فرمادیا جائے کہ مطمح نظر نہ کسی کی ذات کی حمایت ہے نہ مخالفت، صرف مسئلہ زیر بحث میں فلاں فلاں غلط اندازیوں کی تصحیح کرنا ہے۔

امید ہے کہ مزاج سامی بعافیت ہوگا۔ جواب سامی کا منتظر رہوں گا۔

پرسان حال حضرات خصوصاً مولوی ایوب صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔
والسلام۔اگر جناب کے پاس یہ رسالہ نہ پہنچا ہو تو میں وہ بھیج دوں جو میرے پاس پہنچا ہے۔

احقر محمد طیب

از دارالعلوم دیوبند

۴؍شعبان ۱۳۶۳ھ یوم چہارشنبہ

....

حضرت المحترم زید مجدکم السامی!

بعد سلام مسنون عرض ہے، گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، والا نامہ سے بے حد مسرت ہوئی۔
اللہ تعالیٰ جناب کو جزاء خیر عطا فرمائے، آپ کی علالت سے فکر ہے، حق تعالیٰ صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرمائے۔ یہ مجھے علم نہ تھا کہ جناب قاسمی خطبہ صدارت کا جواب لکھ چکے ہیں، حقیقتاً اسے جلد چھپوانے کی ضرورت تھی، میں مئوآئمہ خود ہی لکھ رہا ہوں۔آپ کے دیوبند تشریف لانے کی خبر سے خوشی ہے، خدا تعالیٰ خیر و عافیت سے ملاقات نصیب فرمائیں۔آمین

احناف کانفرنس کے بارہ میں مولانا بہاء الحق صاحب قاسمی کا والا نامہ آیا تھا کہ میں دیوبند کب آؤں، کانفرنس کے سلسلہ میں بات چیت کرنا ہے، مگر ابھی تک آنے کی صورت پیدا نہیں ہوئی، مجھے سفر پیش آگیا شاید اخیر عشرہ میں آویں۔

آپ کو اللہ تعالیٰ جلد صحت کاملہ عطا فرمائے، پرسان حال حضرات کی خدمات میں سلام مسنون واستدعاء دعاء عرض ہے، والسلام۔ احقر محمد طیب (دارالعلوم دیوبند ۱۶-۸-۶۳ھ)

حضرت المحترم زید مجدکم السامی!

بعد سلام مسنون عرض ہے، گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔ جواب میں تاخیر ہوگئی، رمضان مبارک سے پہلے تو سفر رہے اور رمضان میں ہنگامی مشاغل کا تسلسل ایسا رہا کہ امروز وفردا میں آج ۲۱ر دن ہوگئے۔ تحقیق اہل حدیث کا نسخہ پہنچ چکا ہے اور ماشاء اللہ بہت ہی مقنع اور مشبع ہے۔ تبصرہ کے جواب کے بارہ میں مئو آئمہ والے مصر ہیں، میں نے انھیں تاکید لکھی ہے کہ طباعۃ میں سستی نہ کریں۔ انشاء اللہ جلد ہی چھپ جائے گا، آج کل طباعت کی مشکلات حد تحمل سے باہر ہورہی ہیں۔ مولوی ثناء اللہ صاحب سے پہلے کے تلامیذ شیخ الہند کے بارہ میں زبانی تحقیق یہاں کے موجودہ حضرات سے کی، پتہ نہیں چلا، بات بہت پرانی ہوچکی ہے اور پرانے لوگ ختم ہوچکے ہیں، اگر اتنا معلوم ہوجائے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے کس سنہ میں دارالعلوم میں پڑھا، یا کس سنہ میں فارغ ہوئے تو رودادوں میں تلاش کیا جائے، ورنہ رودادوں کا بھی ایک جنگل ہے، بلا نشان راہ اس میں رہ روی دشوار ہے۔ مولانا بہاء الحق صاحب قاسمی شعبان میں تشریف لائے تھے، لیکن مولانا خیر محمد صاحب اس وقت نہ آسکے، اس لیے ممدوح بے نیل مرام واپس ہوگئے۔ کل ان کا خط پھر آیا تھا کہ وہ اور مولانا خیر محمد صاحب اور مولانا ابوالوفا صاحب ۶ رشوال کو دیوبند اس سلسلہ میں پہنچیں گے۔ میں نے عرض کردیا ہے کہ ۱۲ رشوال تک میرے ایک سفر کا پروگرام ہے، اب معلوم نہیں کب آویں گے۔

قاسم العلوم نادر ہوچکی ہے، صرف ایک نسخہ کتب خانہ دارالعلوم میں ہے اور بوسیدہ بہت ہے، قواعد کتب خانہ کے ماتحت وہ باہر نکالنے کا میں مجاز نہیں ہوں، اس لیے ارسال سے مجبوری ہے، باقی اس سلسلہ میں اگر نقل وغیرہ کی کوئی خدمت درکار ہو تو اطلاع دی جائے۔

جناب کی طبیعت اب کیسی ہے؟ پہلے ایک خط سے ناسازی طبع کا حال معلوم ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرماویں، آمین۔

یہاں بحمد للہ بہمہ وجوہ خیریت ہے، والسلام۔

احقر

محمد طیب از دارالعلوم دیوبند

۲۲- ۹- ۶۳ھ

حضرت المحترم زید مجدکم السامی!

بعد سلام مسنون عرض ہے، بحمد اللہ مع الخیر والعافیت میں صبح دیوبند پہنچ گیا ہوں، سب کو خیریت سے پایا والحمد للہ۔

مئو سے چلتے وقت مولوی عزیز احمد صاحب نے احقر کا بسترہ باندھا تو اس میں وہ سرخ رنگ کی دری بھی بندھ گئی، جو شب کو میرے بسترہ کے نیچے وہیں کے حضرات نے بچھادی تھی، لکھنؤ پہنچ کر جب بسترہ کھلا تو اس حقیقت کا علم ہو کر افسوس ہوا، مولوی صاحب موصوف نے نادانستگی میں ایسا کیا وہ بھی متأسف ہوئے۔ بہر حال دری امانت رکھی ہوئی ہے خط آنے پر اسے پارسل کیا جاسکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مجھے یہ دری پسند آئی، آپ فرمائیں تو میں یہاں سے اس کی قیمت منی آرڈر کردوں، خط کے ذریعہ قیمت کی اطلاع دی جائے، جو صورت بھی مناسب سمجھی جائے ان دو میں سے اختیار فرمائی جائے اور کارڈ سے اطلاع دے دی جائے، اسی پر عمل درآمد کیا جاوے گا والسلام۔ یہاں بحمد للہ خیریت ہے۔ حضرت مولانا لکھنؤ ہی میں ہیں، شاید کل تشریف لاویں۔ مولانا محمد ایوب صاحب مولانا عبد اللطیف صاحب اور دوسرے حضرات کی خدمات میں سلام مسنون عرض ہے والسلام باقی عند التلاقی

محمد طیب

از دارالعلوم دیوبند

۱۰-۱-۶۴ھ

حضرت المحترم زید مجدکم!

بعد سلام مسنون عرض ہے بحمد للہ مع الخیر رہ کر متدعی خیریت مزاج گرامی ہوں، بلتھر اروڈ کے جلسہ میں شرکت کے لیے ارادہ ہے کہ ۲۵؍دسمبر یوم چہارشنبہ کو سہارنپور سے طوفان اکسپریس سے روانہ ہوکر پنجشنبہ کی شب میں شاہ گنج اور شاہ گنج سے پنجشنبہ کو صبح سات بجے کی گاڑی سے چل کر غالبًا ایک بجے مئو کے اسٹیشن پر پہنچوں گا، اگر اتنا وقت ہوا کہ میں گھر میں پہنچ کر ملاقات کرسکا تو حاضر ہوں گا ورنہ پھر جناب کو اسٹیشن پر تکلیف فرمانی ہوگی، کیونکہ ملاقات کو عرصہ ہوگیا ہے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ مولانا ایوب صاحب اور مولانا عبد اللطیف صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔ امید ہے کہ آپ سب حضرات مع الخیر ہوں گے،

والسلام۔

محمد طیب غفرلہ ازدیوبند

۲۷-۱-۶۶ھ یکشنبہ

....

حضرت المحترم زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ولید پور سے بھی دعوت نامہ صادر ہوا اور گرامی نامہ نے اسے اور موکد کردیا۔ وقت کی قلت اور بزرگوں کے احکام گویم مشکل نگویم مشکل۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں سدھاری کا دعوت نامہ بھی قبول کروں، ورنہ ولید پور آنا اور سدھاری کو دو سال کی دعوتیں دیتے رہنے کے باوجود نظر انداز کرنا موجب طوفان ہوگا، مارچ کے اوائل میں صرف دو تین دن خالی ہیں، پس وپیش میں مقامی غیر مقامی پروگرام ہیں، لہٰذا صورت یہ ہے کہ ۳/مارچ ولید پور میں میری حاضری کی تاریخ رکھ لی جائے، ۴/مارچ کو سدھاری ہوتا ہوا واپس ہوجاؤں گا۔ اگر یہ تاریخ منظور ہو تو اطلاع فرمادی جائے تاکہ اندراج کرلیا جائے۔ ورنہ مارچ میں اس تاریخ کے سوا حاضری مشکل ہے، یہی جواب مولوی عبدالحلیم صاحب کو بھی لکھ رہا ہوں۔

امید ہے کہ مزاج سامی بعافیت ہوگا، دعا میں یاد فرمایا جاوے۔ والسلام

محمد طیب

دارالعلوم دیوبند

۹-۳-۶۶ھ

....

حضرت المحترم زید مجدکم السامی!

بعد سلام مسنون ہے الحمدللہ مع الخیر رہ کر متدعی خیریت مزاج گرامی ہوں۔ کتب خانہ دارالعلوم کی اہمیت اور عظمت کے پیش نظر مجلس شوریٰ شعبان ۷۲ھ نے طے کیا ہے کہ ہر سال جدید الطبع اہم اور مفید کتابوں کا (اندرون بجٹ) کتب خانہ میں اضافہ کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں نئی کتابوں کے حاصل کرنے کی طرف مہتمم کو توجہ دلانے اور متعلقہ معلومات بہم پہنچانے کے لیے مجلس شوریٰ شعبان

۲۷ھ نے تین حضرات ممبران شوریٰ کی ایک کمیٹی بنادی ہے جس کے ایک رکن جناب ہیں۔ شوریٰ کی اس نہایت ہی مفید تجویز کو پیش کرتے ہوئے گذارش ہے، کہ جناب اس بارہ میں اپنی قیمتی معلومات سے احقر مہتمم کی رہنمائی فرماتے رہیں، اور جب بھی کوئی ایسی کتاب جناب کے علم میں آئے جو اپنی نوعیت اور افادی حیثیت سے اہم یا کتب خانہ دارالعلوم کے شایان شان ہو، تو دفتر اہتمام کو ضرور مطلع فرمادیا جایا کرے، تاکہ اس کی خریداری اور حصول کی سعی کی جاوے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، والسلام۔

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۵- ۹- ۲۷ھ

....

حضرت محترم زید مجدکم!

بعد سلام مسنون، حضرت مولانا مفتی محمود احمد صاحب رکن شوریٰ کی یہ تجویز مجلس شوریٰ محرم ۹۴ھ میں پیش ہوئی، کہ حضرات ممبران شوریٰ دارالعلوم کے شعبہ جات کو باہم تقسیم فرمالیں اور اپنے لمحات فرصت میں دارالعلوم پہنچ کر متعلقہ شعبہ جات کی دیکھ بھال فرمالیا کریں۔ تاکہ ہر شعبہ اپنے کاموں میں بیدار بھی رہے اور خاطر خواہ ترقی کرتا جائے۔ مجلس شوریٰ نے مولانا موصوف کی اس تجویز کو بنظر استحسان دیکھا اور بطوع ورغبت اس کا خیر مقدم کیا اور ہر شعبہ جات کو باہم تقسیم کرلیا۔

چنانچہ جناب اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب [۱] کے ذمہ شعبہ دارالافتاء اور کتب خانہ، رسالہ، شعبہ تبلیغ کی نگرانی رکھی گئی ہے۔ امید ہے کہ جناب اسے منظور فرماویں گے اور جب تشریف آوری کا ارادہ ہو پہلے سے مطلع فرماویں گے۔ والسلام

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۴-۲-۴۷ھ

(۱) ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی مرحوم سابق صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی مراد ہیں۔

حضرت محترم زید مجدکم السامی!

بعد سلام مسنون عرض ہے، فتاویٰ دارالعلوم کو منظر عام پر لانے اور عوام مسلمین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی غرض سے عرصہ سے یہ تجویز ذہن میں تھی کہ ان فتاویٰ کو باب وار ترتیب دلا کر کتابی شکل میں شائع کرایا جائے اور حسب ضروریات زمانہ، جدید انداز پر ترتیب دیا جائے، یہ تجویز مجلس شوریٰ ۷۲ھ میں بھی رکھی اور مجلس شوریٰ محرم ۷۴ھ میں بھی پیش کی گئی۔ حالیہ مجلس نے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر مندرجہ ذیل حضرات کی ایک کمیٹی بنائی ہے، یہ کمیٹی مسئلہ کے مالہ وعلیہ پر غور وفکر کر کے فیصلہ کے لیے اپنی رپورٹ مجلس عاملہ میں پیش کرے گی اور مجلس عاملہ ہی آخری فیصلہ صادر کرے گی، رکنیت کمیٹی کی اطلاع دیتے ہوئے میری گذارش ہے کہ جناب اپنی قریبی فرصت میں دیوبند تشریف لاکر کمیٹی کا ہاتھ بٹائیں اور وقت تشریف آوری سے مطلع فرمادیں، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجلس انتظامیہ کے انعقاد کے زمانہ میں ہی ایک یوم پہلے اس کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوجائے تو صرف آپ کو جداگانہ دعوت دینی پڑے گی، بقیہ اور سب ارکان کمیٹی انتظامیہ کے ممبر بھی ہیں تو انھیں دو دفعہ سفر کی زحمت نہ اٹھانا پڑے گی، ورنہ جیسی آپ حضرات کی رائے ہو اُس سے مطلع فرماتے ہوئے خود ہی وقت کی تعیین فرمالیں۔ اُسی کے مطابق دعوت نامہ جاری کردیا جائے گا، امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ والسلام

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۷- ۲- ۷۴ھ

ارکان کمیٹی یہ ہیں:

حضرت صدر مدرس

حضرت مولانا مفتی محمد عتیق صاحب

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

احقر مہتمم

حضرت محترم زید مجدکم!

سلام مسنون۔ترتیب فتاویٰ کے لائحۂ عمل پر غور کرنے کے سلسلے میں سابقہ عریضہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ اگر حضرات ممبران کمیٹی مجلس عاملہ کے انعقاد کے وقت تشریف لاویں تو اس صورت میں اس کمیٹی مجلس عاملہ کے شریک ممبران کے لیے بھی سہولت ہوگی اور مدرسہ پر مالی بار بھی کم پڑے گا۔چنانچہ اس عریضہ کا جواب جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے دیا اور اس رائے سے اتفاق فرمایا،اب جب کہ ۸؍دسمبر کو مجلس عاملہ کا جلسہ ہورہا ہے،مناسب ہے کہ ترتیب فتاویٰ کی کمیٹی کے ممبران دوایک یوم قبل تشریف لاویں،تاکہ اس سفر میں اس کام سے بھی فراغت ہوجائے۔امید ہے کہ جناب اپنی تشریف آوری اور وقت سے مطلع فرماویں گے۔امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا،والسلام

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند ۲۷-۳-۷۴ھ

....

حضرت محترم زید مجدکم!

سلام مسنون۔مجلس عاملہ کے لیے ۲۰؍دسمبر ۵۴ء یوم دوشنبہ مقرر کیا گیا ہے،اس لیے جناب سے استدعا ہے کہ دو یوم قبل یعنی ۱۸؍دسمبر کو دیوبند تشریف لاویں،تاکہ ۱۸؍اور ۱۹؍دسمبر کو ترتیب فتاویٰ کی کمیٹی کرکے رپورٹ مرتب کی جائے،اور ۲۰؍دسمبر کو مجلس انتظامیہ میں پیش کردی جائے۔اس صورت میں مجلس عاملہ کے ارکان کو (جو مذکورہ کمیٹی کے بھی رکن ہیں) سفر مکرر کی زحمت اٹھانا نہ پڑے گی۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔والسلام

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۸-۴-۷۴ھ

حضرت المحترم زید مجدکم السامی!

بعد سلام مسنون عرض ہے، مجلس شوریٰ کا دعوت نامہ مع ایجنڈا ملاحظہ سے گزر چکا ہوگا، جس میں جلسہ کی تاریخیں ۲۶/۲۷ فروری ۵۵ء دی گئی تھیں، لیکن حضرت مولانا مدنی مدظلہ چونکہ ایک طویل سفر میں تشریف لے جارہے ہیں اور ان تاریخوں تک واپسی نہیں ہوسکے گی، اس لیے انھیں ملتوی کرکے اب جلسۂ شوریٰ کی تاریخیں بمشورہ حضرت ممدوح ۲۷/۲۸ مارچ ۵۵ء مطابق ۲/۳ شعبان ۷۴ھ یوم یکشنبہ دوشنبہ قرار پائی ہیں۔ امید ہے کہ شرکت جلسہ سے سرفراز فرمایا جاوے گا، ایجنڈا بدستور ہے، جسے محفوظ رکھا جاوے۔ والسلام

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۳-۶-۷۴ھ

....

حضرت محترم زید مجدکم!

سلام مسنون نیاز مقرون۔ آج ہی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا والا نامہ پہنچا کہ متعلقہ شعبہ جات کے معائنہ کے لیے جلسۂ شوریٰ سے ایک دن قبل دیوبند پہنچیں گے، جناب کو بھی اس کی اطلاع کردی جائے، کیونکہ آپ اور ممدوح متعلقہ شعبہ جات میں شریک ہیں۔ جلسۂ شوریٰ ۱۱/ستمبر ۵۷ء یوم یکشنبہ سے شروع ہورہا ہے، اس لیے آپ کو ممدوح الصدر کے ایماء کے تحت ۱۰/ستمبر کا دن دیوبند میں گذارنا چاہئے۔ وہ بھی غالباً ۱۰/کو علی الصباح یا ۹/کو علی المساء پہنچ جائیں گے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ والسلام۔

محمد طیب از دیوبند

۱۷- ۱- ۷۵ھ

....

حضرت المحترم زید مجدکم السامی!

سلام مسنون نیاز مقرون۔ فون کی اطلاع مل گئی تھی، آج والا نامہ بھی پہنچ گیا۔ یہاں کی کچھ ایسی مجبور کن ضروریات سامنے آگئی ہیں کہ بمبئی کا پروگرام بھی ملتوی کرنا پڑا اور میں راندیر ہی سے فوری

واپسی کے ساتھ دیوبند پہنچوں گا، اس ایک دو ماہ میں اس قدر پروگرام مقامی ہوگئے کہ ان کا نمٹانا مشکل ہوگیا۔ اس لیے بصد ادب اس وقت تو معافی چاہتا ہوں، پھر کسی وقت اس ارشاد کی تعمیل کی سعی کروں گا۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، والسلام۔

محمد طیب از دیوبند
۲۹-۷-۷۷ھ

....

حضرت محترم زید مجدکم!

سلام مسنون نیاز مقرون، گرامی نامہ اور پچاس نسخے کتاب اعیان الحجاج کے موصول ہوکر موجب ممنونیت ہوئے، اللہ تعالی جزاء خیر عطا فرماویں، رسید ضابطہ ہمرشتہ ہے، انھیں میں سے میں نے ایک نسخہ ذاتی رکھ لیا ہے، رسید ۵۰ نسخوں کی ہے، اس لیے ایک نسخہ کسی کی معرفت روانہ فرمادیں تاکہ مدرسہ میں داخل کردیا جائے، بارادۂ حج ۴ر جون کو دیوبند سے بمبئی روانہ ہو رہا ہوں، دعاء کا مستدعی ہوں، والسلام۔

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
یکم-۱۱-۷۷

....

حضرت المحترم زید مجدکم السامی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، اعیان الحجاج کا موقر ذخیرہ شرف صدور لایا، نہایت ہی مفید اور پاکیزہ کتاب ہے، کاش احقر کے لیے بھی ایک نسخہ اس ذخیرہ کے ساتھ آجاتا تو میں اسے سفر حج میں ساتھ رکھ لیتا، اب مدرسہ سے مستعار لینا پڑے گا الا یہ کہ ۳ر جون تک پہنچ جائے، کیونکہ ۴ر جون ۵۸ء کو روانگی کا ارادہ کیا ہے۔ جس طالب علم کے بارہ میں ایماء فرمایا گیا ہے حسب ایماء گرامی تحت قانون اس کی امکانی اعانت کی سعی کی جاوے گی، مستدعی دعاء ہوں، والسلام۔

محمد طیب از دیوبند
۹-۱۱-۷۷ھ

حضرت المحترم زید مجدکم!

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، علالت اور ناسازئ مزاج سے تأسف ہوا، مزید تأسف جلسۂ شوریٰ میں شریک نہ ہوسکنے سے ہوا، اللہ تعالیٰ جناب کو صحت کاملہ عطا فرمائے، امید کہ اب طبیعت بحال ہوگئی ہوگی۔ یہاں بحمداللہ بہمہ وجوہ خیریت ہے، دعا کا مستدعی ہوں۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند

۱۰- ۷- ۸۳ھ

....

حضرت المحترم المخدوم زیدت معالیکم!

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ مورخہ ۱۵ر ستمبر ۶۹ء باعث شرف ہوا، مجلس شوریٰ کی بدلی ہوئی دوسری تاریخیں بھی بدل گئی ہیں اور بدلنی پڑیں جیسا کہ مراسلہ متعلقہ سے جواب مل چکا ہوگا علم میں آ گئی ہوں گی۔ اور اب انشاء اللہ دوسری تاریخیں جو شعبان کی پندرہ کے بعد کی ہوں گی آں محترم کی تشریف آوری ممکن ہوگی۔

علالت مزاج سے برابر فکر ہے۔ حق تعالیٰ جناب کو صحت کاملہ عطا فرما کر مسلمانوں اور بالخصوص اہل علم کے افادہ کے لیے تا دیر قائم رکھے، آمین۔ دارالعلوم میں خیریت ہے اور سب جناب کے لیے دعا گو ہیں، بہر حال اواخر شعبان میں تشریف آوری کی پوری امید اور توقع ہے اور تشریف آوری ضروری بھی ہے۔ سفر میں یقیناً تکلیف تو ہوگی مگر امید ہے کہ بحق دارالعلوم اسے برداشت فرما لیا جائے گا، دارالعلوم میں اسباق برابر ہو رہے ہیں اور سب اساتذہ خواندگی پوری کرانے میں لگے ہوئے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ایک ماہ سے زائد کا حرج پورا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے مجلس تعلیمی نے مجبور ہو کر یہ تجویز کیا ہے کہ امتحان سالانہ تا بمقدار خواندگی لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ اس اسٹرائک سے سب سے زیادہ نقصان طلبہ کا ہی ہوا ہے۔ امتحان ہو جائے گا، لیکن جس کی جتنی خواندگی رہ گئی ہے اور اس سے نقص استعداد پیدا ہوا وہ امتحان سے زائل نہ ہو سکے گا۔ پھر محض حرج ہی نہیں ہوا کہ سبق نہیں ہوئے، بلکہ منافی سبق کاموں میں مشغول رہنے کے سبب سے طلبہ کا ذہن جو مشوش ہوا ہے اس نے معنوی طور پر پورے سال کی خواندگی پر اثر ڈالا ہے، جسے امتحان دور نہیں کرسکتا۔ بہر حال اس وقت

طلبہ اور اساتذہ اسباق میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آئندہ ایسے حالات سے محفوظ رکھے۔ امید ہے کہ اب مزاج سامی بعافیت ہوگا دعا کا محتاج اور خواستگار ہوں۔ کتاب السنن سے وقتاً فوقتاً استفادہ کرتا ہوں، حق تعالیٰ سے علمی اور عملی نفع کی امید ہے، والسلام۔

محمد طیب از دیوبند

۷- ۷- ۸۹ھ

....

حضرت المحترم المکرّم زیدت معالیکم!

سلام مسنون نیاز مقرون۔ مزاج گرامی، مجلس شوریٰ کے موقع پر جناب نے طبقۂ علیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ صدر مدرسی کے لیے فرمایا تھا کہ گو اس وقت کوئی نام ذہن میں نہیں لیکن میں مایوس بھی نہیں ہوں۔ اس لیے درخواست ہے کہ ذہن سامی میں کوئی نام آیا ہو تو اُسے تحریر فرمادیا جائے۔ اس وقت ہمیں طبقۂ علیا میں ایسے مدرس بلکہ محدث کی ضرورت ہے، جو صحاح ستہ پڑھائے ہوئے ہو اور پڑھا رہا ہو حدیث میں قابل اعتماد استعداد ہو، تاکہ شوال سے پہلے پہلے کسی کا انتخاب کیا جاسکے۔ امید ہے کہ اس بارہ میں ذکر فرمایا جاوے گا۔ خدا کرے کہ مزاج گرامی بعافیت ہو، والسلام۔

جناب کے وقتاً فوقتاً دارالعلوم میں تشریف لاتے رہنے سے متعلق مجلس شوری نے جو تجویز پاس کی ہے وہ بلفظہ ارسال ہے۔

اس کا عملی سلسلہ انشاءاللہ شوال سے شروع کیا جائے گا، والسلام۔

محمد طیب

از دیوبند

۲۶-۷-۹۲ھ

....

نقل تجویز مجلس شوریٰ رجب ۱۳۹۲ھ

نمبر ۱۴- مجلس شوریٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے اس وعدہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کا احترام کرتی ہے کہ آپ دیوبند تشریف لاکر کچھ روز قیام فرمایا کریں

گے اور طالبان علوم کو استفاضہ کا موقع دیا کریں گے، مجلس اس وعدہ کا احترام کرتے ہوئے توقع رکھتی ہے کہ حضرت ممدوح سال میں چند بار اس افادہ کا موقع دیا کریں گے۔ حضرت موصوف سے اس سلسلہ میں رابطہ رکھا جائے۔ آمد ورفت اور قیام کے جملہ انتظامات من جانب دارالعلوم کیے جائیں۔

نقل مطابق اصل

۲۷-۷-۹۲ھ

....

حضرت المحترم زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

خدا کرے جناب مع الخیر اور بعافیت ہوں، جناب محترم کی علمی خدمات اور ممالک اسلامیہ میں ان خدمات کے اعتراف سے دارالعلوم دیوبند کو مسرت ہے، یہ واقعہ ہے گذشتہ سالوں میں آنمحترم نے علم حدیث کی جو قابل قدر خدمت انجام دی ہے اور اس خدمت کے نتیجہ میں حدیث کے جو نایاب ذخیرے طبع ہو کر اہل علم کے سامنے آئے ہیں، اس کے لیے آنمحترم ملت اسلامیہ بالخصوص اہل علم کی طرف سے مستحق شکریہ وتبریک ہیں، اللہ تعالیٰ یہ عظیم خدمات قبول فرمائیں۔

دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ اہل علم کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور بلاشبہہ یہ ہم سب کا مشترکہ علمی سرمایہ ہے، یہاں بہت سی نئی اور پرانی کتب طبع شدہ موجود نہیں ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں جناب بیروت تشریف لے جارہے تھے، ہمارے مدیر کتب خانہ مولانا ظفیر الدین صاحب نے ایک لمبی فہرست بھیجی تھی، کہ انھیں وہاں سے بھجوائیں، دارالعلوم شکر گذار ہے کہ آنمحترم نے توجہ فرمائی اور تین بنڈل کتابیں وہاں سے آئی بھی ہیں، مگر آپ کے واپس ہونے کے بعد وہاں سے کتابیں آنی بند ہوگئیں اور اس فہرست کا بہت کم حصہ آسکا ہے۔

ادھر مجلس شوریٰ نے پھر ضرورت محسوس کی کہ اہل علم حضرات کو اس طرف متوجہ کیا جائے، اس سلسلہ میں جناب محترم کا نام نامی خصوصی طور پر ہم سب کے سامنے آیا، اس لیے بھی اور اس لیے بھی کہ معلوم ہوا کہ جناب محترم جامعہ ازہر کی طلب پر قاہرہ تشریف لے جانے والے ہیں، وہاں سے کتابیں آسانی سے آسکتی ہیں، ضرورت محسوس ہوئی کہ توجہ سامی ادھر منعطف کرائی جائے، ہم سب کی خواہش

یہ ہے کہ آنمحترم غیر ممالک میں اپنا انتساب دارالعلوم سے ضرور ظاہر فرمائیں، تاکہ اس سے دارالعلوم کو بھی فائدہ ہو اور لوگوں کو بھی معلوم ہو کہ آپ کا علمی اور روحانی تعلق ہندوستان کی ایک مرکزی تعلیم گاہ سے ہے، جو ام المدارس کی حیثیت رکھتی ہے، اہل علم کی مجلس میں موقع موقع سے اگر چند کلمات دارالعلوم کی علمی خدمت کے متعلق بھی فرمائے جاتے رہیں اور ساتھ ہی کتب خانہ کا تذکرہ اور غیر ممالک سے اس کے لیے کتابیں منگوانے حتی کہ قیمتاً بھی حاصل کرنے میں جو قانونی مشکلات ہیں توقع ہے کہ ان مشکلات کے رفع ہونے کی کچھ صورتیں پیدا ہو جائیں گی اور دارالعلوم کو خاطر خواہ فائدہ ہوگا، نیز ہمارے کتب خانہ میں نئی عربی مطبوعات کی جو کمی محسوس کی جارہی ہے وہ بھی باقی نہ رہے گی، امید ہے کہ آنمحترم ادھر ضرور توجہ فرمائیں گے، اس کے ساتھ یہ بھی گذارش ہے کہ اگر کچھ نئی کتابیں آپ کے پاس ہوں اور ان کے ملنے کی اس سفر میں امید ہو یا حاصل کرنے کی سعی بھی ہو، تو وہ کتابیں اگر قیمتاً دارالعلوم کو بھجوادی جاویں تو کتب خانہ کے خلا کو پر کرنے کا ایک مختصر راستہ ہوگا، جیسے المطالب العالیۃ اور مصنف عبدالرزاق وغیرہ بھی بھجوادی جائیں دارالعلوم قیمت ادا کردے گا، مصنف عبدالرزاق کے لیے مجلس علمی سملک کو بھی متوجہ کرنے کا ارادہ ہے، امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، خدا کرے کہ یہ علمی سفر بعافیت تمام وبفوز مرام پایۂ تکمیل کو پہنچے، والسلام۔

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۲- ۳- ۹۴

....

حضرت محترم المقام زیدت معالیکم!

سلام مسنون نیاز مقرون، تار کے ذریعہ اہلیہ محترمہ کے سانحۂ رحلت کی رنجدہ اطلاع ملی [1]،
إنا لله وإنا إليه راجعون، احقر کا تعزیتی تار موصول ہو چکا ہوگا۔

اس نازک موقع پر خدمت سامی میں جناب والا کے سامنے صبر وتسلی کا کیا مضمون عرض کیا جائے کہ ہر بات جو اس ذیل کی لائق عرض ہے بقیہ صفحہ ۷۳ پر

(۱) حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ کی رحلت ۹/ جون ۱۹۷۹ء مطابق (غالباً ۲۱/ رجب) ۱۳۹۹ھ کو ہوئی تھی (مرتب)۔

وفیات

مسعود احمد الاعظمی

مولانا شفیق احمد خاں صاحب

۴؍رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۴؍جولائی ۲۰۱۳ء کو جنوبی ہند کی مشہور درس گاہ مظاہر علوم سیلم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا شفیق احمد خاں صاحب کا انتقال ہوگیا۔ إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔

ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق اگست ۱۹۸۶ء کی بات ہے، مدرسہ مرقاۃ العلوم میں - جو ۱۹۷۹ء میں قائم ہوا تھا - دورۂ حدیث کا پہلا سال تھا، اور راقم الحروف کی جماعت دورۂ حدیث شریف کا درس لینے والی تھی، چونکہ محدث کبیر حضرت علامہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ بذات خود بخاری شریف اور بعض دوسری کتب حدیث کے اسباق پڑھانے والے تھے، اس لیے طلبہ کی امنگیں اپنے شباب پر تھیں کہ ع

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

ابھی بخاری شریف کا سبق شروع نہیں ہوا تھا اور غالباً ذی قعدہ کی پہلی یا دوسری تاریخ تھی کہ دو عربی عالم کی بالکل اچانک اور غیر متوقع تشریف آوری ہوئی، اُن میں سے ایک آج کل کے مشہور ماہر فن قرأت اور سعودی عرب کے رئیس القراء شیخ ایمن رشدی سوید تھے، اور دوسرے صاحب شیخ موسیٰ طیار تھے، جو پیشے سے پائلٹ تھے، یہ دونوں صاحب حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ اور تحصیل علم کی غرض سے آئے تھے۔ شیخ موسیٰ طیار تو صرف رسالۃ الأوائل حضرت سے پڑھ کر اور اس کی سند لے کر اسی دن واپس چلے گئے، اور شیخ ایمن سوید نے تقریباً تین ہفتے مقیم رہ کر یہاں کی سردی گرمی اور ہر طرح کی تکلیف اور مشقت برداشت کرکے حضرت کے پاس بخاری شریف کا خاصا حصہ پڑھا۔

بخاری شریف کے درس کا جب آغاز ہوا تھا، ان ہی دنوں ایک اور عالم بھی حضرت سے پڑھنے کے لیے وارد ہوئے تھے، وہ اس وقت ایک مدرسے کے شیخ الحدیث تھے، اور عمر ۶۰ سال سے متجاوز

رہی ہوگی، یہ حضرت مولانا شفیق احمد خاں صاحب تھے، جو مدرسہ مظاہر العلوم سیلم کے شیخ الحدیث تھے، اور غالباً وہی اس مدرسہ کے بانی اور مؤسس بھی تھے۔

سبق شروع ہونے کے دو ہفتے بعد حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی کام سے گورکھپور جانا پڑا، تو ساتھ میں مولانا شفیق احمد صاحب اور شیخ ایمن کے علاوہ راقم بھی ہم رکاب تھا، دو تین روز وہاں قیام رہا اور درس کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہا، وہیں سے ٹرین پر سوار ہوکر مولانا شفیق احمد خاں صاحب واپس سیلم روانہ ہوگئے۔

مولانا شفیق احمد صاحب اپنے قیام مئو کے دوران حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادگان اور آپ کے متعلقین سے بہت مانوس ہوگئے، اور ہم ساتھیوں کے ساتھ مولانا جب تک مئو میں مقیم رہے، شفقت کا معاملہ کرتے رہے، اور جب واپس چلے گئے تو مستقل یاد آتے رہے، صرف طالب علمی کے ایام میں نہیں، بلکہ اس وقت سے اب تک وہ زمانہ ہمیشہ یاد آتا رہتا ہے۔

اس واقعے پر تقریباً پچیس برس گزر گئے ہوں گے، تقریباً آٹھ مہینے پیشتر تجارتی مقصد سے والد صاحب کے ساتھ راقم کا جنوب کا سفر ہوا، سیلم جنوبی ہند کے مشہور صوبے تاملناڈو کا ایک اہم تجارتی وکاروباری شہر ہے، ہمارے سفر کی ایک منزل سیلم بھی تھی، میرے اوپر تجارت کے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ مولانا شفیق احمد صاحب سے ملاقات کا شوق غالب تھا، سیلم سے قریب ہی ایک تاریخی مقام سنکری ڈرگ ہے، یہ مولانا اقبال احمد صاحب قاسمی کا وطن ہے، جن سے جمعیۃ علماء ہند کی نسبت سے احقر کو نیاز مندانہ تعلق ہے، ہم لوگ ۲۱/ دسمبر ۲۰۱۳ء کو جمعہ سے قبل سنکری پہنچے، اور مولانا اقبال احمد صاحب کے ہاں ایک دن اور رات قیام کرکے ان کے صاحب زادے کے ہمراہ ۲۲/ دسمبر کی صبح میں تقریباً ۹/ بجے سیلم پہنچے، مظاہر علوم سیلم شہر سے تقریباً ۹/ کلومیٹر دور شاہراہ عام پر واقع ہے، ہم لوگ مظاہر پہنچے تو حضرت مولانا شفیق صاحب کا درس جاری تھا، درس ختم ہونے کے بعد ہم لوگ حاضر خدمت ہوئے، تو مولانا بہت تپاک سے ملے، نہایت شفقت ومحبت سے پیش آئے، حالانکہ ہم لوگ سنکری سے ناشتہ کرکے گئے تھے، لیکن اصرار کے ساتھ ناشتہ کرایا، ہمارے دونوں ماموں حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حاجی سعید احمد صاحب نیز مدرسہ مرقاۃ العلوم اور مئو شہر کے احوال معلوم کرتے رہے، ہر چند کہ ہمارے پاس وقت کم تھا اور ہم کو ابھی بازار بھی جانا تھا، لیکن حضرت والا نے نہایت

اصرار کے ساتھ کہا کہ مہمان خانے میں آرام کریں اور دوپہر کا کھانا کھا کر ہی جائیں، چنانچہ مولانا کے ساتھ ہی ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا، پھر انھوں نے اپنے نواسے (مولانا نعمان صاحب جو اسی مدرسے میں مدرس ہیں) کی گاڑی سے ان کے ساتھ سیلم شہر بھیج دیا، شہر میں ہم کو کافی تاخیر ہوگئی، مغرب بعد ان کے نواسے ہم کو لینے کے لیے شہر آگئے، ہم لوگ مدرسہ پہنچے تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا، اور عشاء کے بعد ہم کو سیلم سے روانہ ہونا تھا، جلدی جلدی کھانے سے فارغ ہوئے، جب ہم نکل رہے تھے تو نماز شروع ہونے والی تھی، مسجد کے راستے میں ہی مولانا سے ملاقات ہوئی، اور انھوں نے نہایت عزت واحترام اور شفقت ومحبت کے ساتھ ہم کو رخصت کیا۔ اور ہمارے دلوں میں لطف وعنایت کا ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ دیا۔

مولانا مرحوم کی شخصیت جنوبی ہند میں بہت معروف ومشہور تھی، ان کی ذات سے اس علاقے میں کافی فیض پہنچا، ان کو پورے خطے میں مرجعیت حاصل تھی، درس وتدریس کے ساتھ ذکر وشغل کا بھی اہتمام تھا، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کے خلفاء میں تھے۔ اصلاً دیوبند کے تھے۔ تقریباً تیس سال سے مظاہر علوم سیلم کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے، اور اس مدت میں بہت سے طلبۂ علوم دینیہ ان سے فیض یاب ہوکر فارغ التحصیل ہوئے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مولانا مرحوم پیکر اخلاق، متواضع اور شریف الطبع انسان تھے، طلب علم کا جذبۂ فراواں رکھتے تھے، ۶۰-۶۵ سال کی عمر میں ہزاروں کلومیٹر کا سفر کرنا اور شیخ الحدیث کے منصب پر ہوتے ہوئے زانوئے تلمذ تہ کرکے طالب علموں کی طرح علم سیکھنا، ایسا وصف ہے جو آج کے دور میں کم ہی نظر آتا ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔

....

مولانا محمد طیب صاحب ادروی

۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ = ۳۱ جولائی ۲۰۱۳ء کو یہ خبر ملی کہ ادری کے معمر اور موقر عالم مولانا محمد طیب صاحب کا انتقال ہوگیا إنا للّٰه وإنا إليه راجعون.

مولانا محمد طیب صاحب ضلع مئو کے قصبہ ادری کے ایک علمی ودینی گھرانے میں ۱۳۴۵ھ میں پیدا ہوئے، والد کا نام منشی محمد رضا تھا، جو نیک، صالح اور دیندار آدمی تھے۔ مولانا محمد طیب نے فیض الغرباء نامی ایک مدرسہ سے تعلیم وتربیت کا آغاز کیا، ابتدائی تعلیم اپنے قصبے میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں داخل ہوئے، اس وقت محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی اور مولانا محمد ایوب صاحب رحمہم اللہ وغیرہ کے نفوس قدسیہ اور درس وتدریس کی وجہ سے مفتاح العلوم کا غیر معمولی شہرہ تھا، اور اس کا آفتاب نصف النہار پر تھا، مفتاح العلوم سے اکتساب علمی کے بعد آپ سہارنپور گئے، آپ کے صاحبزادے حافظ محمد اسعد صاحب اپنے والد مولانا محمد طیب صاحب سے سن کر روایت کرتے ہیں کہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے امتحان لیا تو آپ سے دیوان متنبیّ کے بارے میں پوچھا، مولانا نے عرض کیا کہ میں دیوان متنبیّ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی سے پڑھ کر آیا ہوں، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نے اسی وقت کتاب بند کردی کہ جب مولانا سے دیوان متنبیّ پڑھی ہے تو پھر اس کے متعلق کیا پوچھنا، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سے آپ کا خصوصی تعلق تھا۔ ۱۹۴۷ء میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی خدمت میں بخاری شریف پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے، سرپرست المآثر حضرت مولانا رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کے مفتاح العلوم میں رفیق درس رہے۔

آپ نے اصلاح وتزکیہ کا تعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ سے قائم کیا، اور ان کے دست مبارک پر بیعت ہوئے، جمعیۃ علماء ہند سے تاعمر وابستہ رہے، ۱۹۵۴ء میں آپ کے قصبے میں حضرت مولانا اسیر ادروی، مولانا محمد طیب اور ان کے احباب کی جدوجہد سے جمعیۃ علماء کی ایک عظیم الشان کانفرنس ہوئی، جس میں اس وقت کے اکابر جمعیۃ شریک ہوئے، اور کانفرنس کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔

۱۹۵۴ء میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کے ایک خلیفہ مولانا احمد اللہ صاحب نے مغربی بنگال کے مقام برن پور میں مدرسہ اسلامیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، تو اس کی تعمیر وترقی اور خدمت درس وتدریس کے لیے مولانا محمد طیب کو لے گئے، مگر آپ بیماری کی وجہ سے جلد ہی واپس لوٹ گئے، اور اپنے قصبے میں مولانا اسیر صاحب کے ساتھ مل کر مدرسہ دارالسلام قائم کیا اور اس کی تعمیر

وترقی کے لیے بھرپور محنت اور جدوجہد کی۔

۱۹۷۱ء میں حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے دوبارہ برن پور گئے، اور وہاں مدرسہ اسلامیہ میں دوبارہ درس وتدریس کی مسند سنبھالی، اور اس وقت سے تادم آخر علم ودین کی خدمت انجام دیتے رہے، آپ برن پور میں ۴۰؍سال سے زیادہ رہے، اور اس مدت میں وہاں کے عوام وخواص کو آپ کی ذات سے خاصا فیض پہنچا۔

مولانا ایک جیدالاستعداد اور پختہ کار عالم ہونے کے ساتھ نیک، دیندار اور متقی بزرگ تھے، زندگی سادہ اور تکلف سے پاک تھی۔

بیماری کی وجہ سے چند مہینوں سے گھر پر ہی مقیم ہو گئے تھے، اور کئی مہینے صاحب فراش رہنے کے بعد رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ کے پہلے دن سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالی حضرت مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، درجات کو بلند فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆......☆☆......☆☆......☆

ایک بڑھیا کا ایمان ویقین

نیشا پور میں ایک بڑھیا تھی، جو دروازے دروازے بھیک مانگا کرتی تھی، جب اس کا انتقال ہوا، تو کسی نے اس کو خواب میں دیکھا، پوچھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ بڑھیا نے کہا کہ یہاں آنے پر مجھ سے سوال ہوا کہ بڑھیا کیا لائی ہے؟ میں نے ایک آہ کھینچی اور کہا کہ ساری عمر تو مجھ کو اسی دروازہ کا حوالہ دے کر لوگ کہا کرتے تھے، کہ بڑی بی آگے جائیے، خدا دے گا۔ اور آج یہاں پہنچی تو یہ سوال ہوتا ہے، کہ کیا لائی ہے؟

میرے اس جواب پر ارشاد ہوا، کہ سچ کہتی ہے، اس کو چھوڑ دو۔

(اہل دل کی دل آویز باتیں)